اسلام اور عصرِ جدید

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملّیہ اسلامیہ۔ ۲۵

اسلام اور عصرِ جدید

مدیر

اقتدار محمد خاں

نائب مدیر

محمد سعید انور

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵

اسلام اور عصرِ جدید (سہ ماہی)

(جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر)

جلد نمبر: ۵۶ اپریل ۲۰۲۴ء شمارہ: ۲

ISSN 2278-2109

اعانت زر کی شرحیں

	فی شمارہ	سالانہ	
اندرون ملک	100/روپے	380/روپے	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
پاکستان و بنگلہ دیش	4/امریکی ڈالر	15/امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
دیگر ممالک	12/امریکی ڈالر	40/امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے)

حیاتی رکنیت

اندرون ملک	5000/روپے
پاکستان و بنگلہ دیش	150/امریکی ڈالر
دیگر ممالک	400/امریکی ڈالر

اس شمارے کی قیمت 100/روپے

پرنٹنگ اسسٹنٹ: راشد احمد **ٹائٹل:** ارتج گرافکس

© جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ
مقالہ نگاروں کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

پتہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

Website: www.jmi.ac.in/zhiis E-mail:zhis@jmi.ac.in

طابع وناشر: **پروفیسر اقتدار محمد خاں** اعزازی ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۲۵

مطبوعہ : لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

بانی مدیر

ڈاکٹر سید عابد حسین (مرحوم)

مجلسِ ادارت

پروفیسر محمد شکیل (صدر)

- پروفیسر طلعت احمد
- نجیب جنگ آئی۔اے۔ایس (ریٹائرڈ)
- سید شاہد مہدی آئی اے ایس (ریٹائرڈ)
- لیفٹیننٹ جنرل محمد احمد ذکی (ریٹائرڈ)
- پروفیسر اختر الواسع
- پروفیسر محمود الحق
- پروفیسر سلیمان صدیقی

فہرست

❐	حرف آغاز	اقتدار محمد خاں	۷
❐	مدارس میں دینی اور عصری تعلیم کا امتزاج	سعود عالم قاسمی	۱۳
❐	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی عصری حسیت اور عالمی مسائل کا ادراک	محمد ارشد	۲۵
❐	مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کا نظریۂ تعلیم	ابوالکلام قاسمی شمسی	۴۱

- امام شاہ ولی اللہ دہلوی — شاہ احمد حسین جعفری کریمی — ۵۷
- تاریخ دعوت وعزیمت: ایک تعارف — ضیاء الحسن فاروقی — ۷۹
- ترجمۂ مثنوی معنوی
  قاضی سجاد حسین — تنقیدی مطالعہ — مغیث احمد — ۸۷
- صوبۂ بہار کا جغرافیائی وتاریخی پس منظر — انیس الرحمٰن قاسمی — ۱۱۳
- مدارس کی تعمیر وترقی میں وحدتِ تعلیم کا کردار — محمد اسامہ — ۱۲۹

حرف آغاز

ام المومنین سیدہ صفیہ رضی اللہ عنھا کا اصلی نام زینب تھا، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کا نام ''صفیہ'' رکھ دیا۔ یہ یہودیوں کے قبیلہ بنونضیر کے سردار اعظم حیی بن اخطب کی بیٹی ہیں اور ان کی ماں کا نام حزہ بنت سموئل ہے۔ یہ خاندان بنی اسرائیل میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور ان کا شوہر کنانہ بن ابی الحقیق بھی بنونضیر کا رئیس اعظم تھا جو جنگ خیبر میں قتل ہو گیا۔ سلسلہ نسب کچھ اس طرح ہے: صفیہ بنت حُیی بن اخطب بن سعید بن عامر بن عبید بن خزرع بن ابی حبیب بن نضیر۔ جبکہ والدہ کا نام ''برہ'' یا ''حزہ'' تھا جو قبیلہ بنوقریظہ کے سردار سموئیل کی بیٹی تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہا کی ولادت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت سے تقریباً دو سال بعد ہوئی۔ سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کا قبیلہ بنونضیر تھا، یہ یہود کا بہت ممتاز قبیلہ تھا۔ اولاد نبی

اور قبیلہ کے سردار ہونے کی وجہ سے آپ کو معاشرے میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ والدہ کی طرف سے بھی آپ رضی اللہ عنہا کے خون میں سرداری کے اوصاف پائے جاتے تھے۔

آپ رضی اللہ عنہا کی عمر جب ۱۴ برس کی ہوئی تو آپ کی شادی سلام بن مشکم القرظی سے کر دی گئی لیکن کچھ عرصہ بعد سلام بن مشکم نے آپ رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی۔ سلام بن مشکم اپنے قبیلہ بنو نضیر کا سردار تھا، اسلام دشمنی میں بہت سرگرم رہا کرتا تھا۔ غزوہ بدر کے بعد جب قریش مکہ کے رئیس ابوسفیان (ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے) اپنے مقتولین بدر کا انتقام لینے کے لیے دوسو اونٹ سواروں کے ساتھ مدینہ کی طرف بڑھے تو سیدھے اسی سلام بن مشکم قرظی کے پاس آئے تھے۔ انھوں نے ابوسفیان کا پر جوش استقبال کیا، اعلیٰ قسم کے کھانے کھلائے، شراب پلائی اور حملہ کرنے کے لیے مدینہ طیبہ کے مخفی راز بھی ابوسفیان کو دیے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ طیبہ کی ہجرت، لوگوں کو اسلام کی دعوت اور اس دعوت کی قبولیت کے نتیجے میں لوگوں کا جوق در جوق اسلام میں داخل ہونا یہ ایسے امور ہیں جن کی وجہ سے مدینہ میں پہلے سے موجود مذہبی اثر ورسوخ کے مالک یہود کے مذہبی وقار میں خاطر خواہ کمی آنے لگی۔ بت پرست مشرکوں میں تسلسل کے ساتھ پھیلتی ہوئی یہودیت، سکڑ گئی۔ دوسری طرف مکہ کے قریشی بدر میں ہلاک ہونے والے اپنے سرداروں کا انتقام لینے اور اسلام کو ختم کرنے کے لیے مدینہ کے یہودیوں کو اپنے ساتھ ملا رہے تھے۔ مدینے کے یہود اور مشرکین مکہ کی سانٹھ گانٹھ اس بات پر ہو چلی تھی کہ نومسلموں کو ہراساں کیا جائے، انھیں اسلام سے روکا جائے اور کسی طرح اسلام کو مٹا دیا دیا

جائے۔سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کے قبیلے بنونضیر نے ایک بار سازش کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتھر گرا کر قتل کرنا چاہا،لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس سازش کی اطلاع کر دی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے راستے سے بحفاظت نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔دوسری بار قریش مکہ کے کہنے پر بنونضیر نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنا چاہا اور چال یہ چلی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام بھیجا کہ آپ تین آدمی لے کر ہمارے پاس تشریف لائیں،ہم بھی تین علما کو ساتھ لے کر آتے ہیں۔آپ اسلام سمجھائیں،اگر ہمارے علماء نے آپ کی دعوت کو تسلیم کر لیا تو ہم بھی ایمان لے آئیں گے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منظور فرمایا۔راستے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ تلواریں باندھ کر آپ کو قتل کرنے کے درپے ہیں۔تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کیا۔کئی دن تک یہ محاصرہ جاری رہا۔بالآخر بنونضیر کو مدینہ سے جلاوطنی اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔وہ اس شرط کے ساتھ راضی ہوئے کہ جس قدر مال واسباب اونٹوں پر لے جا سکیں، لے جانے دیں تو ہم مدینہ سے نکل جائیں گے۔چنانچہ جلاوطنی پر مجبور ہونے والوں میں سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کے والد حیی بن اخطب اور سلام بن ابی الحُقیق ، کنانہ بن الربیع کے علاوہ چند دیگر لوگ بھی بنونضیر سے خیبر کی طرف چلے گئے ، وہاں لوگوں نے ان کا اس قدر احترام کیا کہ خیبر کا سردار تسلیم کر لیا۔خیبر پہنچ کر آپ رضی اللہ عنہا کے والد نے آپ کا نکاح کنانہ بن ابی الحُقیق سے کر دیا۔کنانہ خیبر کے سردار ابورافع کا بھتیجا تھا اور خود بھی خیبر کے قلعہ القموص کا حاکم تھا۔

محرم ۷ھ میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان خیبر کی جنگ واقع ہوئی جس میں مسلمان فتح یاب ہوئے۔خیبر یہودیوں کا مرکز تھا جو

مدینہ سے ۱۵۰ کلومیٹر عرب کے شمال مغرب میں تھا جہاں سے وہ دوسرے یہودی قبائل کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کے خلاف اس طرح کی سازشیں خیبر کی جنگ کا سبب بنیں۔ جنگ خیبر میں کئی نامور پہلوان اور یہودیوں کے سردار مارے گئے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے خاندان کے سارے افراد اسی غزوے میں قتل کر دیے گئے یا جنگی قیدی بنا لیے گئے۔ جنگ کے بعد تمام قیدی اور مال غنیمت ایک جگہ جمع کیے گئے۔ قیدیوں میں حضرت صفیہ بھی تھیں۔ غنیمت کی تقسیم میں حضرت صفیہ حضرت دحیہ کلبی کے حصے میں آئیں۔ بعد میں صحابہ کی رائے ہوئی کی حضرت صفیہ چونکہ شاہزادی رہی ہیں اس لیے خاندانی وقار کے پیش نظر بہتر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی کفالت حاصل ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مشورہ قبول فرما لیا۔ اور وحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو دوسری لونڈی عطا فرما کر سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کو آزاد کر دیا اور یہ اختیار دیا کہ وہ چاہیں تو اپنے گھر چلی جائیں اور اگر چاہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آ جائیں۔

اسی موقع پر سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا نے اسلام کو دل و جان سے قبول کر لیا اور اہل ایمان کی صف میں شامل ہو گئیں۔ ابراہیم بن جعفر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں: جب صفیہ رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا: ''تمہارے والد برابر میرے سخت ترین یہودی دشمنوں میں سے رہے، یہاں تک کہ اللہ نے انھیں ہلاک کر دیا۔'' پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا: ''فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے، اگر تم اسلام قبول کر لو تو میں تمہیں اپنے پاس ہی روک لوں گا،

اور اگر تم یہودیت پر برقرار رہنا چاہو، تو ایسا ہے کہ میں تمہیں آزاد کیے دیتا ہوں، تم اپنی قوم کے پاس چلی جاؤ۔'' حضرت صفیہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں تو آپ کے دعوت دینے سے پہلے ہی سے اسلام کی مشتاق تھی اور دل سے آپ کی تصدیق کر چکی تھی۔ جب میں یہاں آئی ہوں تب بھی مجھے یہودیت میں کوئی رغبت نہیں تھی اور اب تو نہ ان میں کوئی میرا باپ ہے نہ بھائی۔ آپ نے مجھے کفر و اسلام کے درمیان اختیار دیا ہے تو میرا فیصلہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول مجھے آزادی اور اپنی قوم میں لَوٹنے سے زیادہ عزیز ہیں۔

سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنا ہی پسند فرمایا، خیبر سے واپسی پر جب آپ سد الروحاء کے مقام پر پہنچے تو سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا حیض سے پاک ہوئیں تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا اور دوسرے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت ولیمہ کی۔ ان کا حق مہر ان کی اپنی آزادی تھی۔ یہاں سے چلتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کو خود اپنے اونٹ پر سوار فرمایا اور خود اپنی چادر مبارک سے ان پر پردہ کیا۔ دعوت ولیمہ وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ مدینہ منورہ تشریف لائیں۔ آپ رضی اللہ عنہا کو حضرت حارث بن نعمان انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان پر ٹھہرایا گیا۔ آپ رضی اللہ عنہا کے حسن و جمال کا تذکرہ مدینہ کی عورتوں میں پھیل گیا چنانچہ ازواج مطہرات اور انصار و مہاجرین کی خواتین آپ کو دیکھنے کے لیے تشریف لائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات میں تمام ازواج مطہرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عیادت کے لیے حضرت عائشہ رضی

اللہ عنہا کے حجرے میں تشریف لائیں۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بے چینی کی حالت میں دیکھا تو آپ کا دل بھر آیا چنانچہ آپ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! کاش آپ کی بیماری مجھے ہو جاتی۔'' ازواج مطہرات نے ان کی طرف دیکھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''واللہ وہ سچّی ہیں۔'' یعنی ان کا اظہار عقیدت سچے دل سے ہے۔

آپ نے دس حدیثیں بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں جن میں سے ایک حدیث بخاری و مسلم دونوں کتابوں میں ہے اور باقی نو حدیثیں دوسری کتابوں میں درج ہیں۔ ان کی وفات کے سال میں اختلاف ہے، بعض کا قول ہے کہ ۵۰ھ میں ان کی وفات ہوئی اور بعض نے لکھا ہے کہ ۵۲ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ بوقت رحلت ان کی عمر ساٹھ برس اور بعض قول کے مطابق ۶۵ برس کی تھی۔ یہ بھی مدینہ کے مشہور قبرستان جنت البقیع میں سپرد خاک کی گئیں۔

اقتدار محمد خاں

سعود عالم قاسمی *

مدارس میں دینی اور عصری تعلیم کا امتزاج

مدارس اسلامیہ کا ایک شاندار ماضی ہے، دین کی حفاظت اور علوم دین کی اشاعت میں ان کا نمایاں کردار رہا ہے، عمومی تعلیم اور خواندگی کے فروغ میں ان کی خدمات بے مثال ہیں۔ ملک کی آزادی اور پُرامن سماج کی تعمیر میں اُن کا نمایاں رول رہا ہے۔ مدارس نے ملک وملت کو مخلص، جری، اور بے لوث خدمت گار اور معلم ومصلح عطا کیے۔ مدارس اسلامیہ کا فیض صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہا ہے بلکہ غیر مسلموں نے بھی فیض پایا ہے۔ اس لیے مدارس اسلامیہ کی عظمت سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا اور ان کی خدمات کی تخفیف نہیں کی جاسکتی۔ مدارس پر فرقہ پرستی، دہشت گردی اور ملک دشمنی کے جتنے الزامات لگائے گئے وہ سب وقت کی کڑی جانچ کے آگے غلط ثابت ہوئے اور مدارس نے اپنی علم دوستی اور انسان سازی کے چراغ کی لو کو بجھنے نہیں دیا۔ مدارس کی بدولت سماج کے ایک بڑے طبقہ میں خداپرستی، انسانیت نوازی، اخلاق ومروت کی آبیاری ہوئی اور حب الوطنی کا شعور پیدا ہوا۔ ان مدارس نے سرکاری امداد اور مستقل ذرائع آمدنی سے محرومی کے باوجود تعلیمی بیداری اور سماجی بہبود کا فریضہ انجام دیا۔ انگریزی عہد میں مسلمانوں نے اقتدار کھویا تو اپنی توجہ دینی سرمایہ کی حفاظت اور اسے نئی نسل تک

* پروفیسر وصدر شعبہ سنی تھیالوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

منتقل کرنے پر مرکوز کی۔ اس مقصد کے لیے دینی تعلیم کے آزادانہ مدارس ومکاتب کے قیام کو انھوں نے ترجیح دی۔ چنانچہ ملک کے شہروں، قصبات اور دیہات میں مدارس کا سلسلہ قائم کر دیا۔

مدارس کی بہتر کارکردگی، ملک وملت میں ان کی موثر نمائندگی اور بدلتے ہوئے حالات میں ان کی افادیت کے لیے ان کے ''نصاب اور نظام تعلیم پر ہر زمانہ میں غور کیا گیا۔ مدارس کے ذمہ داروں نے اپنی فکری ہمت اور مالی استطاعت کو سامنے رکھ کر کچھ مشورے قبول کیے اور کچھ قبول نہ کر سکے۔ مگر اس ضرورت سے سبھی واقف تھے کہ بدلتے ہوئے حالات اور ملکی ضروریات کے تناظر میں اور خود فضلائے مدارس کے مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے روایتی نصاب سے آگے بڑھ کر مناسب علمی وعملی اقدام کرنا لازم ہے۔ ورنہ علوم شرعیہ کی تعلیم اپنے نفاذ کے لیے زمین ساز گار نہ پا سکے گی اور اپنی وسعت وافادیت کا دائرہ محدود کر لے گی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے مدارس کی تعلیم کو حالات وزمانہ سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیتے ہوئے ۱۳؍جنوری ۱۹۴۸ء میں کہا تھا:

> ''تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ زمانہ کی جو چال ہے اس کے ساتھ جڑ سکے، اگر آپ مذہب اور عصر دونوں ٹکڑوں کو الگ رکھیں گے تو وہ تعلیم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی، آج جو تعلیم آپ ان مدرسوں میں دے رہے ہیں وقت کی چال سے اسے کیسے جوڑ سکتے ہیں، نہیں جوڑ سکتے، نتیجہ یہ ہے کہ زمانہ میں اور آپ میں ایک اونچی دیوار کھڑی ہے''۔[۱]

سرسید احمد خاں دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی کو مادرزاد ولی اللہ سمجھتے تھے اور ان کے بارے میں کہتے تھے:

> ''ابتدا ہی سے آثار تقوی اور ورع اور نیک بختی اور خداپرستی ان کے اوضاع اور اطوار سے نمایاں تھے۔''[۲]

مولانا نانوتوی کے قائم کردہ مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے بارے میں بھی سرسید کا کہنا تھا:

> ''دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگار ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعہ سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جما رہے''۔[۳]

دارالعلوم دیوبند اور اس کے بانی کی عظمت کا اعتراف کرنے کے ساتھ سرسید دارالعلوم دیوبند کے قدیم طرز کے نصاب اور نظام تعلیم سے مطمئن نہ تھے اور زمانہ کے تقاضوں کے لحاظ سے اسے مرتب کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ ۱۲۸۹ھ میں مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مدرسہ کی سالانہ رپورٹ سرسید احمد خاں کو بھیجی۔ سرسید نے اس رپورٹ پر اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق یکم جمادی الثانی ۱۲۹۰ھ میں تبصرہ کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ دین کی نشر واشاعت کے لیے صرف قدیم علوم کافی نہیں ہیں بلکہ جدید علوم کا جاننا بھی ضروری ہے۔ انھوں نے لکھا:

> ''اگر ایک جیالوجی کا جاننے والا آموجود ہو اور بموجب قواعد اور تجربہ جیالوجی کے مذہب اسلام اور قرآن مجید پر اعتراض کرنا شروع کردے، یا ایک کیمسٹری جاننے والا کیمسٹری کے قواعد سے مسلمات مذہب اسلام کی تردید شروع کردے، یا ایک جدید ہیئت داں قرآن مجید کے بیانات پر شبہات ڈالے یا جیسا کہ اس زمانہ میں برابر ہو رہا ہے کہ پادریوں اور مسلمانوں سے مذہبی مباحثہ ہو تو یہ لوگ کیا حمایت دین اسلام کر سکتے ہیں، اس لیے کہ ان علوم سے مطلق واقف نہیں ہیں''۔[۴]

سرسید احمد خاں نے علماء کو عصری علوم اور زبان سے فائدہ اٹھانے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا:

> ''علماء اسلام کو بہت سے مذہبی امور کو بیان کرنے میں دیگر علوم سے استمداد لینی پڑتی ہے اور اس لیے مذہبی علوم کے لیے دیگر علوم کا حاصل ہونا ضروری ہے اور وہ دیگر علوم ہمارے یہاں کی مذہبی کتابوں میں صرف یونانیوں کی تقلید سے بھرے ہوئے ہیں، پورے طور پر زمانہ حال کی ترقی کے مطابق موجود نہیں ہیں اور اس کے لیے ہم کو مذہب کے لیے بھی کسی یورپ کی زبان کے ذریعہ سے ان علوم کو حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے''۔[۵]

دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داروں نے مدرسہ کے حالات، وسائل، مشن اور طریقہ کار کو سامنے

رکھتے ہوئے سرسید کے مشورہ سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ البتہ عصری علوم کی ضرورت سے انکار بھی نہیں کیا اور اتنی گنجائش رکھی کہ مدرسہ کی تعلیم سے فراغت کے بعد طلبہ کو سرکاری کالجوں میں جا کر ان علوم کو حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ خود مولانا محمد قاسم نانوتوی نے یہ وضاحت کر دی تھی:

''اگر اس مدرسہ کے طلبہ سرکاری مدرسوں میں جا کر جدید علوم حاصل کریں تو یہ بات ان کے کمال میں موئید ثابت ہوگی''۔[۶]

علامہ شبلی نعمانی عمر بھر یہ کوشش کرتے رہے کہ مدارس اسلامیہ میں انگریزی اور سنسکرت زبان کی تدریس کا انتظام کیا جائے اور فلسفہ قدیم کی جگہ جدید علوم کے منتخبات کو شامل کیا جائے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اصلاح نصاب کا بیڑا اٹھایا اور اس کے دوسرے اجلاس شوال ۱۳۱۲ھ مطابق اپریل ۱۸۹۵ء منعقدہ لکھنؤ میں مولوی منصور علی مرادآبادی نے یہ تجویز پیش کی کہ نصاب درس میں علوم جدیدہ کا اضافہ کیا جائے مولانا شبلی مرحوم، مولانا ابراہیم صاحب آروی اور دوسرے اکثر علماء نے ان کے اضافہ کی تائید کی اور اکثریت سے یہ تجویز منظور ہوگئی۔[۷]

علامہ سید سلیمان ندوی افغانستان کے حکمراں نادر شاہ کی دعوت پر ۱۹۳۳ء میں کابل گئے، علامہ اقبال بھی شریک سفر تھے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے افغانستان میں دینی تعلیم کا جو خاکہ پیش کیا وہ عصری اور ابدی علوم کے امتزاج پر مشتمل تھا۔ انھوں نے کہا:

''افغانستان کی عربی و مذہبی تعلیم کا نصاب ایسا ہو کہ طلبہ میں موجودہ زمانہ کے لحاظ سے سیاسی و اجتماعی اصلاحات کی طرف میلان ہو اور ان میں مذہبی شیفتگی بھی پیدا ہو''۔[۸]

میرے استاذ گرامی، مولانا سید انظر شاہ مسعودی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند فرماتے تھے:

''درس نظامی پر غور کیجیے کہ ملا نظام الدین سہالوی نے اس وقت کے رائج عصری علوم وفنون کو داخل نصاب کیا ہے، مثلاً طب، ہیئت، ریاضی، منطق وفلسفہ وغیرہ اور اس طرح خود ملا نظام الدین نے عصری علوم وفنون کے لیے راہ کھول دی، اگر اس وقت ملا نصاب کی تشکیل کرتے تو عصری علوم کو ضرور داخل نصاب کرتے۔ اس حقیقت کے پیش نظر صرف قدیم نصاب پر جمنا

اور جدید نصاب سے فرار قرین دانش نہیں''۔[۹]

ماہر تعلیم جناب سید حامد مرحوم کا کہنا تھا: مدارس کے نصاب میں ان عصری مضامین کا اضافہ ضروری ہے جو قدرت کے کرشموں کے رموز اور انسانی افعال کے محرکات کے سمجھنے اور دعوت کو موثر بنانے میں معاون ہوتے ہیں۔''[۱۰]

مجموعی طور پر علماء نے عصری علوم کی مدارس کے نصاب میں شمولیت کی حمایت تو کی مگر اس کا کوئی تعلیمی اور عملی نظام نہ بن سکا۔ اس لیے کوئی جامع اور مربوط نصاب تعلیم بھی مرتب نہ ہوسکا جو سبھی مدارس کے لیے قابل قبول ہوتا۔

۱۹۸۷ء میں سید حامد مرحوم کی سرپرستی اور سید ہاشم علی وائس چانسلر کی سربراہی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مدارس میں سائنس کی تعلیم، تناسب اور طریقہ کار پر ایک اجلاس منعقد ہوا، ملک کی معتبر دینی درس گاہوں کے علماء اس میں شریک ہوئے اور اس بات سے اتفاق کیا کہ مدارس میں سائنس کی بنیادی تعلیم دی جانی چاہیے۔ اس کام کے لیے اساتذہ کی تربیت ہونی چاہیے اور نصاب ومقدار کا تعیین ہونا چاہیے، یہ اہم کام بہت سست رفتاری سے ہوا، فروری ۲۰۰۷ء میں مرکز فروغ سائنس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے علماء اور سائنس داں حضرات کے تعاون سے ''دینی مدارس کے لیے سائنس کا نصاب'' مرتب کیا۔ مگر میری دانست میں اس پر کوئی خاص عمل نہیں ہوا اور نہ اس پر اضافہ کیا گیا۔ یعنی یہ علمی اور اجتماعی محنت بارآور نہ ہوسکی۔ البتہ جامعۃ الہدایہ جے پور نے اپنے ادارہ میں دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کی تدریس میں پہل کی اور ایک متوازن خاکہ پیش کیا۔ ڈیڑھ سو سال بعد دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داروں نے تقریباً چار ہزار علماء کی موجودگی میں وفاق المدارس کے اجلاس منعقدہ دیوبند ۲۰۲۲ء میں یہ اعلان کیا کہ دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لینے کے لیے طلبہ میٹرک یا ہائی اسکول کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آئیں۔ اگر مدارس نے پہلے ہی یہ مشورہ قبول کرلیا ہوتا تو ان میں مختلف علوم وفنون کے ماہرین کی ایک بڑی تعداد موجود ہوتی، مسلمانوں کی تعلیمی حالت بہتر ہوتی اور ان کو حسرت سے دوسری قوموں کی طرف دیکھنا نہ پڑتا۔ پھر بھی کہنا یہی پڑتا ہے کہ

مایوس نہ ہو ان سے اے رہبر فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

ماہرین تعلیم کا احساس یہ ہے کہ مدارس اسلامیہ میں نصاب تدریس کے مرکزی موضوعات مثلاً قرآن، حدیث اور فقہ کو برقرار رکھتے ہوئے دوسرے امدادی علوم میں غور وفکر کر کے حذف واضافہ کیا جائے اور منتخب عصری علوم کے لیے گنجائش نکالی جائے۔ ابتدائی درجات میں عمومی تعلیم دی جائے اور اعلیٰ درجات میں طلبہ کے ذوق اور استعداد کے لحاظ سے منتخب مضامین کی تدریس کی جائے۔ مدارس میں جتنے طلبہ داخل ہوتے ہیں ان سب سے مفسر اور محدث ومحقق بننے کی توقع نہیں کی جاسکتی صرف منتخب طلبہ کو اس مرحلہ تک جانا چاہیے۔ اگر اساتذہ عصری علوم کی تدریس کے لیے میسر نہ ہوں تو ریٹائرڈ اساتذہ سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ یونیورسٹیوں کے تربیت یافتہ استادوں کی خدمت مختصر مدت کے لیے حاصل کی جاسکتی ہے۔ نیز توسیعی اور امدادی خطبات کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔ آن لائن لکچروں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر چاہت پیدا ہوگی تو راہ ضرور نکل آئے گی۔ NCERT نے انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کا آن لائن انتظام کیا ہے، اس سے اپنے مقام ومدرسہ میں رہتے ہوئے SWAYAM کے ذریعہ استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

برج کورس

ملک کی بڑی یونیورسٹیوں نے فضلاء مدارس کے لیے اعلیٰ تعلیم کے حصول کی سہولت فراہم کی ہے۔ اس مقصد کے لیے ممتاز دینی مدارس کی عالمیت اور فضیلت کی ڈگریوں کو اپنے یہاں بی اے اور ایم اے میں داخلہ دینے کے لیے منظور کیا ہے۔ ان یونیورسٹیوں میں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، ہمدرد یونیورسٹی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی دہلی، برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال، کالی کٹ یونیورسٹی، مدراس یونیورسٹی اور بنارس ہندو یونیورسٹی قابل ذکر ہیں۔

ان میں سے بعض یونیورسٹیوں میں برج کورس کا بھی نظام بنایا گیا ہے تاکہ مدارس کے فضلاء کو انگریزی، سائنس، ریاضی اور سماجی علوم کے منتخب کورس کی تعلیم دے کر اس قابل بنایا جائے کہ وہ یونیورسٹی کے نظام تعلیم کو سمجھ سکیں اور کما حقہ استفادہ کرسکیں۔ اس کورس کا فائدہ آرٹس، سوشل سائنس اور قانون میں داخلہ لینے والے طلبہ کو ہوتا ہے۔ اگر مدارس میں ثانوی درجہ کی سائنس کی تدریس کی کوئی شکل پیدا ہوجائے تو مدارس کے فضلاء یونیورسٹیوں کی سائنس فیکلٹی میں بھی داخلہ لینے کے قابل ہوسکتے

ہیں۔ نیز گریجویشن کے بعد وہ سول سروس کے امتحان میں بھی بیٹھ سکتے ہیں۔

مختلف داخلے واسناد

عصری نظام تعلیم میں طلبہ کی بڑھتی ہوئی متنوع تعلیمی ضرورتوں کے پیش نظر یونیورسٹیوں میں داخل ہونے کی متعدد راہوں اور نکلنے کی بھی متعدد راہوں کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ اگر کسی نے بی اے، بی ایس سی میں داخلہ لیا ہے اور کسی وجہ سے وہ چار سال کا مجوزہ کورس مکمل نہیں کرنا چاہتا تو پہلے سال کی تکمیل پر سرٹیفکیٹ اور دوسرے سال کی تکمیل پر ڈپلوما کی سند اسے دے دی جائے تاکہ وہ اپنی پسند کے دوسرے کورسوں میں داخلہ لے سکے۔ اس نظام میں طلبہ کے لیے سہولت بھی ہے اور نئے مواقع کی تلاش میں معاونت بھی ہے۔ مدارس میں بھی اس نظام پر غور کیا جاسکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ مدرسہ میں داخل ہونے والا ہر طالب علم عالم وفاضل بن کر ہی نکلے۔ دین کی ضروری تعلیم حاصل کر کے اگر وہ کوئی اور مناسب عصری تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے موقع ملنا چاہیے۔ اس کے لیے مدارس کو تعلیمی میقات میں درجہ بندی کے ساتھ ڈگریوں کی تقسیم اور نئے تعلیمی مواقع کے لیے منصوبہ بندی کرنی ہوگی۔

مطالعہ مذاہب

مدارس کا نصب العین دین اسلام کی معرفت، خدمت اور اشاعت ہے۔ طلبہ کی دینی، روحانی، اخلاقی اور عملی تربیت ہے۔ وہ دوسرے مذاہب کی تعلیم وتفہیم سے عام طور پر کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ لیکن قرآن وحدیث میں بار بار دوسرے مذاہب کے عقائد، طریقۂ عبادت، رسم ورواج اور ان کے حاملین کا تذکرہ آیا ہے، خصوصاً مشرکانہ مذاہب، یہودی مذہب، عیسائی مذہب، مجوسی مذہب اور صابئ مذہب کے تذکرے اور ان پر تبصرے بہت ہیں۔ اس لیے مدارس میں دین اسلام کے ساتھ ضمنی طور پر دوسرے مذاہب کو بھی پڑھایا جاتا ہے گو کہ سرسری یا تنقیدی طور پر سہی۔ ماضی میں بہت سے نامور علماء دیگر مذاہب کی بنیادی تعلیم سے واقف تھے اور اپنے طلبہ کو بھی واقف کراتے تھے مثلاً مولانا شاہ عبدالعزیزؒ وغیرہ۔

ہندوستان ایک کثیر المذاہب ملک ہے۔ یہاں ہر لمحہ اور ہر قدم پر دوسرے مذاہب سے

سابقہ پیش آتا ہے، ان کے افراد سے خوش گوار تعلقات رکھنے کے لیے اور پُر امن طریقہ سے رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے عقائد، عبادات رسوم اور تہذیب کو سمجھا جائے۔ مدارس اسلامیہ کی بڑی جماعتوں میں تفہیم بین المذاہب کا کورس رکھنا بقائے باہم اور اشاعت دین کے لیے مفید اور مناسب ہوگا۔ اس کے نصاب اور نظام کے لیے کمیٹی بنانے اور متعدد ورک شاپ منعقد کرنے کی ضرورت ہے۔

قانون کی تعلیم

بعض بڑے مدارس نے اپنے طلبہ کو ملکی قوانین سے واقف کرانے کا اہتمام کیا ہے اور اپنے فارغین کی بی اے، ایل ایل بی میں داخلہ لینے کے لیے حوصلہ افزائی کی ہے، اس کے نتیجہ میں بہت سے فضلاء مدارس نے وکالت کی سند حاصل کر کے ضلعی عدالت اور ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی ہے۔ یہ ایک خوش آئند پہل ہے۔ اس سے نہ صرف مسلم سماج کو اپنے حقوق کی بازیابی میں اچھے وکیل ملیں گے بلکہ ملک کو بھی قانون کی تفہیم وتنقید کے لیے صاف ذہن کے وکلا میسر ہوں گے۔ اس موقع پر مدارس کے لیے ذمہ داروں کے لیے مناسب ہوگا کہ وہ اپنے نظام میں ملکی قانون کی مختصر اور ضروری تعلیم کا اہتمام کریں تاکہ طلبہ کو شہری حقوق سے واقفیت بھی ہو اور اس میدان میں آگے بڑھنے کی تحریک پیدا ہو۔ ملک کے ذمہ دار شہری کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری ادا کر سکیں اور اپنے حقوق اور قومی مفادات کا تحفظ کر سکیں، اور عدالتوں کے فاضل ججوں کو مسلم پرسنل لاء کی تفہیم میں علمی مواد فراہم کر سکیں۔

پیشہ ورانہ تعلیم

دینی مدارس میں پیشہ ورانہ تعلیم کی حیثیت ہمیشہ سے ضمنی رہی ہے، اصل توجہ شرعی علوم کی تعلیم وتدریس اور طلبہ کی دینی تربیت پر مرکوز رہی ہے، مگر مدارس کے ذمہ داروں میں طلبہ کے معاشی مستقبل کا خیال بھی کسی درجہ میں دامن گیر رہا ہے۔ اسی لیے بہت سے مرکزی مدارس نے اپنے یہاں شرعی علوم کے ساتھ ضمنی اور جزوی طور پر بعض پیشہ ورانہ تعلیم کو بھی جگہ دی ہے، مثلاً خطاطی، خیاطی، طب اور فنون کی تعلیم دی جاتی رہی ہے۔ فراغت کے بعد طلبہ کے لیے طب کی تعلیم کے مستقل ادارے بھی قائم کیے گئے ہیں۔ اس وقت بہت سے مدارس میں کمپیوٹر کی تعلیم اور تربیت دی جارہی ہے۔ اس رجحان کو آگے بڑھاتے

ہوئے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے اسکل دیولپمنٹ پروگرام سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔حکومت کی اسکیم برائے گروہی ترقی اور تکنیکی تعلیم سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ نیز پالی ٹکنیک کے سرکاری اور تعلیمی اداروں کی رہنمائی میں موزوں اسکیم تیار کی جاسکتی ہے۔اس طرح سے تعلیم اور روزگار میں تال میل ہوگا اور طلبہ کو بہتر معاشی مواقع ملیں گے۔

دینی تعلیم کا مختصر مدتی نصاب

دینی مدارس میں اسلامی علوم کی تدریس کا دورانیہ اعدادیہ کے بعد آٹھ سالوں پر محیط ہوتا ہے۔ بہت سے طلبہ اس مدت کی تکمیل نہیں کر پاتے اور تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیتے ہیں۔ بہت سے طلبہ مجبوری میں یہ مدت پوری کرتے ہیں اور بہت سے اپنی مرضی سے پوری کرتے ہیں۔اس مدت تعلیم کے علاوہ دینی تعلیم کا مختصر مدتی نصاب جو چار سالوں پر محیط ہو جاری کرنا چاہیے تاکہ دوسرے شعبہ حیات کے شایقین بھی دینی علوم سے استفادہ کرسکیں۔ میرے استاذ حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند فرماتے تھے کہ دینی مدارس میں تین طرح کے طلبہ داخل ہوتے ہیں۔ دس فی صد طلبہ ذہین ہوتے ہیں جو اساتذہ کی تربیت سے لائق وفائق ہوتے ہیں اور دینی تعلیم ان کی پسند اور ترجیح ہوتی ہے۔ان کی تعلیم وتربیت کی جائے تو ہر علم کے ماہرین پیدا ہوں گے اور وہ دین کے خدمت گار بنیں گے۔

دوسری قسم ان طلبہ کی ہے جو مدارس میں والدین اور سرپرستوں کی وجہ سے دخلہ لیتے ہیں۔ ایسے طلبہ ۲۵ سے ۳۰ فی صد ہوتے ہیں۔ان طلبہ کو مکمل نصاب پڑھانا ان پر بوجھ مسلط کرنا ہے،ان کے لیے ایک مختصر عربی نصاب چار سالہ تیار کیا جائے تاکہ علوم اسلامیہ سے ان کی مناسبت پیدا ہو اور وہ چاہیں تو اپنے ذوق کے مطابق علوم عصریہ کی تکمیل یونیورسٹیوں میں کرسکیں۔تیسری بڑی تعداد ان طلبہ کی ہوتی ہے جو معاشی مجبوری کے تحت مدارس کا رخ کرتی ہے، یہ ۵۰ سے ۶۰ فی صد ہوتے ہیں۔ان طلبہ کو مدارس کا مکمل نصاب پڑھانا وسائل کا ضائع کرنا اور دینی علوم کے اعتبار کو کم کرنا ہے۔ یہ طلبہ رعایتی نمبروں سے ترقی کر کے فارغ ہو جاتے ہیں لیکن عملی زندگی میں علم سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔لوگ ان کو عالم سمجھ کر مسائل کا حل چاہتے ہیں تو یہ دامن بچاتے ہیں یا غلط رہنمائی کرتے ہیں۔ایسے طلبہ کے لیے ہلکا آسان اور چست نصاب اردو میں تیار کیا جائے تاکہ یہ علاقائی مکاتب ونصاب ومضافات کی

مساجد میں موذنی وامامت وتدریس کے فرائض انجام دے سکیں۔[۱۱]

مدارس میں تخصص کی کلاسیں

مرکزی مدارس میں رسمی دینی تعلیم کی تکمیل کے بعد تخصصات کی کلاسیں بھی ہوتی ہیں جن میں دلچسپی رکھنے والے منتخب فارغین کو تعلیم وتربیت دی جاتی ہے۔ مثلاً **تخصص فی التفسیر**، **تخصص فی الحدیث**، **تخصص فی الفقه** وغیرہ اس نظام کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے اور اسے حالات وزمانہ کے تقاضوں کے مطابق مفید اور موثر بنایا جاسکتا ہے۔ مثلاً **تخصص فی اللغات**، **تخصص فی المذاهب** اور **تخصص فی التحقیق** وغیرہ کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اس نظام کے ذریعہ وقت کے ابھرتے ہوئے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے علماء کی ٹیم تیار کی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے بہت زیادہ مالی وسائل اور افرادی نوٹ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ خاص طور پر ہندوستانی مذاہب اور انگریزی وہندی کی تعلیم کا نظم بنایا جاسکتا ہے۔

اساتذہ کی تربیت

مدارس اسلامیہ کے مدرسین کی فکری اور فنی تربیت کا کوئی مضبوط اور مربوط نظام ابھی تک قائم نہیں ہے۔ بعض مدارس اساتذہ کی تربیت کے لیے کبھی کوئی پروگرام بنالیتے ہیں اور ماہرین تعلیم سے رابطہ بھی کرلیتے ہیں، لیکن یہ کام مستقل اور پائیدار طریقہ سے نہیں ہوتا اور نہ سارے مدارس میں اس طرح کی فکر پائی جاتی ہے۔ ماضی میں سید حامد صاحب مرحوم کی سربراہی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مرکز فروغ سائنس کے تحت مدارس کے اساتذہ کی فنی تربیت کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اسی طرح ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی دہلی نے وزارت فروغ انسانی وسائل کے تعاون سے مدارس کے اساتذہ کی تربیت کا اہتمام کیا تھا۔ یہ سلسلہ بھی تادیر قائم نہ رہ سکا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بڑے مدارس خود اس اہم کام کا بیڑا اٹھائیں اور ماہرین تعلیم سے تعاون حاصل کرکے اساتذہ کی تدریسی، فکری، فنی تربیت کا مربوط اور موثر نظام بنائیں اور یونیورسٹیوں کے تعلیمی شعبہ جات سے تکنیکی رہنمائی حاصل کریں۔ وزارت فروغ انسانی کے مراکز جو یونیورسٹیوں میں قائم ہیں ان سے بھی تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ یونیورسٹیاں اگر بی ایڈ کا کورس اردو میں بنائیں اور مدارس کے اساتذہ کو استفادہ کا موقع

دیں تو یہ ایک بڑا تعلیمی تعاون ہوگا۔

مدارس اور نیشنل اوپن اسکول

قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ء نے اپنی سفارشات میں بارھویں کی سند کو تعلیم کی بنیادی سند قرار دیا ہے۔ مدارس اسلامیہ کے فارغ طلبہ کو ہائی اسکول اور انٹر یا اس کے مساوی سند نہ ہونے کے باعث اعلیٰ تعلیمی اداروں کے مختلف کورسیز میں داخلوں اور ملازمتوں کے حصول میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان طلبہ کے لیے مرکزی وزارت تعلیم کے تحت NIOS ایک بہترین متبادل ہے۔ جو نہ صرف فاصلاتی تعلیم کے ذریعہ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کی تیاری کرواتا ہے بلکہ CBSE اور ICSC کے طرز پر امتحان بھی دلواتا ہے۔ مرکزی وزارت تعلیم کے تحت ہونے کے باعث NIOS کی سند ہر ادارہ میں منظور ہوتی ہے۔ طلبہ اپنی پسند کے مضامین کسی بھی زبان میں لے سکتے ہیں۔ سائنس، کامرس اور دوسرے مضامین میں امتحان دے کر میڈیکل، انجینئرنگ اور آرکیٹیکچر کے شعبوں میں داخلہ لینے کے مجاز ہوجاتے ہیں۔ نہ صرف معاشی وسماجی طور پر پس ماندہ بلکہ ایسے تمام افراد جو کسی سبب سے باضابطہ تعلیم حاصل نہ کرسکے ان کو NIOS تعلیم کا موقع فراہم کرتا ہے۔ NIOS کے اقلیتی سیل کا قیام قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء کے نفاذ کی جانب ایک اہم قدم ہے۔ یہ سیل مسلم طلبہ کو نہ صرف متبادل تعلیمی نظام کی سہولت فراہم کرتا ہے بلکہ دینی مدارس ومکاتب کو منظوری بھی عطا کرتا ہے۔ اور مدارس اسلامیہ میں اپنے مطالعاتی مرکز کے قیام کے لیے بہت سی سہولت بھی دیتا ہے۔ اس میں فیس میں کمی بھی شامل ہے۔

مدرسہ تعلیمی بورڈ

ہندوستان میں دینی مدارس عام طور پر کسی نہ کسی مسلک اور مکتب فکر سے وابستہ ہوتے ہیں اور ایک خاص طرز فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایک مسلک اور مکتب فکر کے مدارس آپس میں ربط وتعلق تو رکھتے ہیں بلکہ وفاق المدارس بھی بنالیتے ہیں، مگر دوسرے مسالک ومکاتب فکر سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ ان سے افادہ اور استفادہ کی کوئی شکل پیدا ہوتی ہے۔ ان تمام مدارس میں جو تدریسی اور انتظامی تجربات ہوتے ہیں یا جو جو مفید اقدامات ہوتے ہیں ان سے تمام مدارس استفادہ نہیں کرپاتے۔ مثلاً

شیعہ، سنی، اہل حدیث، تبلیغی جماعت اور خانقاہی طرزِ فکر کے مدارس کے ایک دوسرے سے ربط وضبط اور اخذ واستفادہ کی کوئی راہ نکل آئے تو مدارس کے تعلیمی نظام کی افادیت وسیع اور دیرپا ہوسکتی ہے اور ملت اسلامیہ کو شیرازہ بندی بھی کی جاسکتی ہے۔ اس کام کے لیے CBSC طرز پر مدارس اسلامیہ کے آزاد بورڈ کی ضرورت ہے۔ مختصر یہ کہ اس وقت مدارس اسلامیہ کے سامنے جو چیلنج ہیں ان کا مقابلہ ہمت وبصیرت سے کرنا ہوگا۔ روایتی طریقوں کی کمیوں کو دور کرنا ہوگا اور نئی مفید اصلاح کے لیے اپنے ذہن کی کھڑکیاں کھولنی ہوں گی۔ قدیم صالح اور جدید نافع کے اصول پر عمل کرنا ہوگا۔

حواشی

۱۔ ایجوکیشنل تھاٹس آف مولانا ابوالکلام آزاد، نٹ سے ماخوذ

۲۔ مقالات، سرسید، علی گڑھ، ۲۰۲۲ء، جلد: ۵، ص: ۱۶۷

۳۔ ایضاً، ص: ۱۶۸

۴۔ ایضاً، ص: ۲۲۸

۵۔ ایضاً، ص: ۳۶۱

۶۔ سوانح قاسمی، جلد: ۲، ص: ۲۸۱

۷۔ حیات شبلی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء، ص: ۲۵۶

۸۔ مجیب اللہ ندوی، افکار سلیمانی، اعظم گڑھ، ۱۴۲۰ھ، ص: ۳۰۴

۹۔ ماہنامہ محدث عصر، دیوبند، اپریل-مئی ۲۰۰۷ء، ص: ۶

۱۰۔ سید منصور آغا، پیکر فکر وعمل: سید حامد، دہلی، ۲۰۱۸ء، ص: ۶

۱۱۔ خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی، حیات وافکار، خدمات، حجۃ الاسلام اکیڈمی، دیوبند، ۲۰۱۸ء، ص: ۴۴۴-۴۴۵

محمد ارشد *

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
عصری حسیت اور عالمی مسائل کا ادراک

بیسویں صدی کا ہندوستان اپنی متنوع خصوصیات کی وجہ سے یادگار زمانہ ہے۔ اسلامیان ہند کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو اس صدی میں اہل علم و دانش کی ایک طویل کہکشاں ہے جس کے چاند ستاروں نے اپنے اپنے میدان ہائے اختصاص میں آنے والی نسلوں کے لیے تحقیق و جستجو کے ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (۲۹/اکتوبر ۱۹۲۹ تا ۱۳/اپریل ۲۰۲۳ء) عصر جدید کے ہندوستانی علماء میں اپنے علم و فضل کی وجہ سے ممتاز و نمایاں تھے۔ مولانا نابغہ روزگار تھے۔ مبداء فیاض سے علم و عمل کا انھیں وافر حصہ ملا تھا۔ خاندانی نجب و شرافت نے اس میں مزید چار چاند لگا دیے تھے۔ روایتی تعلیم کی تکمیل کے بعد جہاں ایک طرف انھوں نے تعلیم و تربیت کو اپنے لیے میدان عمل کے طور پر اختیار کیا وہیں دوسری طرف ان کی کارکردگی اور دل چسپی کا ایک اہم عنوان صحافت تھا۔ دارالعلوم ندوۃ العلما کے خاص ماحول میں اور اپنے خال مکرم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نگرانی و سرپرستی میں مولانا رابع ندوی کے اندر عربی زبان و ادب کا جو مذاق پروان چڑھا اس نے مولانا ندوی کو عرب تاریخ و جغرافیے کے ساتھ وہاں کے سماج و ثقافت اور سیاسی حالات کا بھی پارکھ بنا دیا تھا۔ اسی طرح عربی زبان و ادب کے توسط سے عرب دنیا

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

کے ادیبوں اور صحافیوں سے ان کا جو ربط و تعلق قائم ہوا، اس نے انھیں عالم عرب کے امور مسائل کا بہترین واقف کار و تجزیہ نگار بنا دیا تھا، جس کا بہترین مظاہرہ ہمیں ان کی صحافتی تحریروں میں ملتا ہے۔

صحافت

واقعہ یہ ہے کہ تصنیف و تالیف مولانا محمد رابع حسنی ندوی کی دل چسپی کا ایک اہم حوالہ رہا ہے اور صحافت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عربی رسالے البعث الاسلامی[1] میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ تعمیر حیات، لکھنؤ[2] میں ان کے اردو یا عربی زبان میں لکھے ہوئے مضامین و اداریوں کے ترجمے شائع ہوتے تھے۔ انھوں نے عین جوانی کے ایام میں الرائد[3] جیسے عربی جریدے کا اجراء کیا۔ الرائد کا امتیاز یہ رہا کہ اس کے ذریعے ایک طرف عالم عرب کے احوال و کوائف ہندوستانی عربی داں طبقے تک پہنچتے رہے ہیں تو دوسری طرف مختلف امور و مسائل پر ہندوستانی مسلمانوں کے موقف اور نقطہ نظر کی عرب دنیا اور عالم اسلام کے عربی داں حلقوں تک ترسیل ہوتی رہی ہے۔ بلاشبہ الرائد میں مولانا رابع ندوی کے اداریے اور مضامین عالم عرب اور دیگر علمی حلقوں میں سنجیدگی سے پڑھے جاتے رہے ہیں اور ان سے اس کے قارئین کو اپنا موقف تشکیل دینے میں بھی مدد ملتی رہی ہے۔

مولانا محمد رابع ندوی ایک بالغ نظر عالم دین تھے، ان کی فکری بالیدگی میں ان کی عربی زبان دانی، ادب شناسی، عرب تاریخ، تمدن و ثقافت اور وہاں کے سماج و جغرافیے سے واقفیت کا اہم رول رہا ہے۔ ان کے سینے میں ایک حساس دل دھڑکتا تھا اور سر میں ایک متوازن دماغ مسائل کی گتھیاں سلجھاتا رہتا تھا۔ انھوں نے اپنے قلم سے عصری حسیت اور عالمی مسائل کے ادراک کی ایک مضبوط و مستحکم روایت قائم کی۔ عربی زبان و ادب کی جس روایت کے وہ امین تھے، اس نے ان کے اندر ایک طرح کی آفاقیت پیدا کر دی تھی۔ صحافت سے ان کے خصوصی اشتغال اور عالم عرب اور مغربی دنیا کے اسفار نے ان کے مشاہدے اور مستقبل شناسی کے فن کو پوری طرح صیقل کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی حالات و مسائل پر ان کی تحریریں تجزیے اور پیش بندی کے حوالے سے استناد کا درجہ رکھتی ہیں۔

عالم اسلام اور سامراجی نظام: امکانات، اندیشے اور مشورے

بلاشبہ مولانا سید محمد رابع ندوی کا علمی کینواس بہت ہی وسیع تھا اور انھیں حاصل مواقع نے اس

میں چار چاند لگا دیے تھے۔ مولانا ندوی نے مختلف موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے اور چوں کہ عربی زبان اور عرب دنیا کے مسائل سے انھیں خاص دل چسپی تھی اس لیے ان کی عربی صحافت میں ان کی عصری حسیت بہت نمایاں ہوکر ہمارے سامنے آتی ہے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے اواخر سے ہی 'الرائد' اور 'البعث الاسلامی' کے اداریوں اور مضامین میں ان کی عصری حسیت اور عالمی مسائل کے ادراک کو بہت واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مولانا رابع ندوی کے یہ مضامین و اداریے اردو زبان میں ترجمہ ہوکر 'تعمیر حیات' میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ بعد میں انھیں موضوعات کی ترتیب سے کتابی شکل بھی دی گئی ہے۔ مولانا ندوی کے اسی طرح کے اداریوں اور مضامین کا ایک انتخاب ''عالم اسلام اور سامراجی نظام: امکانات، اندیشے اور مشورے'' [۴] کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس مقالے میں مولانا رابع ندوی کی عصری حسیت اور مسائل کے ادراک کے حوالے سے جو کچھ بھی عرض کیا گیا ہے، اس کی بنیاد یہی کتاب ہے۔ کتاب میں شامل مضامین عالم اسلام خاص طور پر عالم عرب کی اس زمانے کی سیاسی و سماجی صورت حال پر اہم روشنی ڈالتے ہیں۔ ان میں واقعیت بھی ہے اور بصیرت افروز تجزیے و تبصرے بھی۔ غور سے دیکھا جائے تو حالات میں ابھی بھی کچھ خاص تبدیلی نہیں آئی ہے بلکہ پہلے سے بدتر ہی ہوئے ہیں، اس لیے اس کتاب میں شامل مضامین آج بھی بامعنی اور اہمیت کے حامل ہیں۔ کتاب کے مقدمے میں اس کا تعارف کراتے ہوئے مولانا نذر الحفیظ ندوی لکھتے ہیں:

> ''پیش نظر کتاب حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے عالم اسلام خصوصا عرب ملکوں کے مسائل و مشکلات اور امت مسلمہ کو درپیش خطرات اور چیلنجز اور مغربی ملکوں کی فکری یورش اور ان کی نسل کشی کی سازشوں کے بارے میں لکھے تھے، چوں کہ بیشتر مضامین عرب ملکوں سے متعلق تھے اس لیے وہ عربی میں براہ راست لکھے گئے، پھر ان کا ترجمہ تعمیر حیات میں شائع ہوا۔ اب انھیں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی طرف سے کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے تا کہ برصغیر کے مسلمان خاص طور سے عالم اسلام اور عرب ملکوں کو درپیش خطرات سے اچھی طرح واقف ہوں اور ان کا دینی و ملی شعور بے دار ہو کہ وہ

بھی اس عالم گیر ملت کا جز ہیں۔''[۵]

چالیس مضامین پر مشتمل یہ کتاب بنیادی طور پر چار حصوں میں منقسم ہے: (۱) جدید چیلنجز اور مسلمان (۲) یورپ اور اسلام (۳) مغربی استعمار کیوں اور کیسے؟ اور (۴) مسلمانوں کی ذمہ داریاں اور تقاضے۔ مولانا رابع ندوی نے اس کتاب میں بہت ہی تفصیل اور دقت نظر کے ساتھ یہ جائزہ پیش کیا ہے کہ مسلم دنیا کے حالات ٹھیک نہیں ہیں، مسلمانوں کو سنگین خطرات اور چیلنجز کا سامنا ہے، یہ خطرات انھیں مغربی استعمار کی جانب سے لاحق ہیں جس نے ظاہری آزادی کے باوجود ان پر ذہنی تسلط قائم کر رکھا اور انھیں فکری و تہذیبی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ مسلم دنیا کو ذہنی و فکری طور پر غلام بنانے کے لیے مغربی مفکرین خاص طور پر مستشرقین کی کار ستانیوں کو بھی مولانا نے بڑے اچھے انداز میں واضح کیا ہے ساتھ ہی ان کے مشرقی جانشینوں کی بھی خبر لی ہے۔ آخر میں مولانا نے مسلمانوں اور ان کے حکمرانوں کو ان کی ذمہ داریوں کی یاد دہانی کرائی ہے ۔مولانا محمد رابع ندوی کا تعلق ایک ایسے خانوادے سے تھا جس نے دعوت و عزیمت کے میدان میں تاریخ رقم کی ہے۔ دعوتی مزاج انھیں ورثے میں ملا تھا اور وہ خود ایک داعی ہیں اس لیے انھیں مسلمانوں کی نئی نسل سے بڑی امیدیں ہیں۔ مولانا رابع ندوی کی تحریروں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ حقیقت بیان کرنے سے گریز نہیں کرتے، وہ بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنی بات کہتے ہیں لیکن اس میں بھی اعتدال و توازن کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ پوری کتاب میں حقیقت پسندی کے ساتھ ملی درد اور جذبے کو بہت ہی واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

عصری حسیت اور مسائل کا ادراک

مولانا محمد رابع ندوی کی عملی زندگی کا آغاز ایک ایسے زمانے (بیسویں صدی عیسوی کی پانچویں دہائی کا آخری حصہ) میں ہوا جب مشرقی دنیا خاص طور پر عالم عرب سیاسی تغیر و تبدل کے اہم مرحلے اور دور سے گزر رہا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد کے حالات میں جب کہ برطانیہ عظمی کا سحر ٹوٹ چکا تھا اور دنیا بھر کی مغلوب اقوام مغربی سامراج سے آزادی پانے کے لیے کوشاں و بے تاب تھیں تبھی عربی زبان کی صحافت کے ایک طالب علم کے طور پر مولانا کو عالم اسلام اور خاص طور پر عالم عرب کا

مشاہدہ و مطالعہ بہت گہرائی اور قریب سے کرنے کا موقع ملا، وہ مقبوضہ ممالک کی آزادی کے لیے کوششوں اوران کے خلاف مغربی سامراجی ریشہ دوانیوں دونوں کو دیکھ رہے تھے،مولانا کو اس حوالے سے ایک ایڈوانٹج (فائدہ) یہ بھی حاصل تھا کہ خود ان کا اپنا وطن ہندوستان بھی انھیں دنوں غلامی کے شکنجے سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا۔اس لیے وہ ان ملکوں کے امور و مسائل سے واقف ہی نہیں بلکہ ان کے بارے میں ایک جچی تلی رائے دینے کا حق بھی بجا طور پر رکھتے تھے،جس کا اظہار کتاب کے مضامین میں جابہ جا ہوا ہے۔

مولانا رابع ندوی مشرقی دنیا کے امور و مسائل کو کتنی باریک بینی سے دیکھتے اور سمجھتے تھے؟اس حوالے سے ان کی حسیت اور عالم اسلام کے مسائل کے ان کے ادراک سے واقفیت کے لیے ان کے یہ جملے بڑے ہی معنی خیز ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

> ''میرے غور وفکر اور مطالعے میں یہ بات آئی کہ مشرقی ممالک جب دینی و سیاسی سمجھ اور زور و طاقت کے لحاظ سے بہت پیچھے چلے گئے تو ان پر مغرب نے یلغار کر کے قبضہ کر لیا تھا،اس میں مغرب کے عسکری و سیاسی تفوق کو بھی دخل تھا اور مشرقی ممالک کی زرخیزی سے فائدہ اٹھانے کی لالچ بھی شامل تھی اور یہ سمجھ بھی شامل تھی کہ ایسے علاقوں کو جہاں انسان رہتے ہوں جانوروں کا علاقہ سمجھ کر قبضے میں نہیں لیا جا سکتا بلکہ انسانوں کے علاقے کو قبضے میں لینے کے لیے وہاں کے باشندوں کے ذہنوں کو بھی متاثر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے،لہذا مغربی سامراجی ممالک نے اس کا بھی پورا لحاظ رکھا اور لٹریچر اور ذرائع تعلیم کو بھی بنیاد بنایا اور یہی وہ پہلو ہے جس کا مداوا ہمارے مشرقی ممالک عرب ہوں یا عجم ابھی تک نہیں کر سکے۔اور اس کی وجہ سے سیاسی و عسکری غلامی کا تو خاتمہ بظاہر ہو گیا لیکن اثر و رعب اور اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنے کا فائدہ مغربی ممالک کو اسی طرح حاصل رہا جس طرح ظاہری غلامی کے دور میں حاصل تھا.....مغربی ممالک نے جب یہ دیکھا کہ آزاد ہونے کا شعور پوری طرح بے دار ہو رہا ہے اور اب ذہنی (ظاہری)

غلامی کے لیے تیار نہیں تو اس نے ان ملکوں کو اس شکل میں آزاد کر دیا کہ یہاں کے باشندوں کو وہ آزادی معلوم ہو اور وہ آزاد ملکوں کی طرح جمہوریت کی گڑیا گڈے کا کھیل کھیل سکیں، لیکن ان ملکوں میں سامراج نے تعلیم اور ذہن سازی کے ذرائع سے یہاں کے ذہنوں میں یورپ کے مقابلے میں احساس کمتری اور ذہنی شکست خوردگی کی ایسی کیفیت پیدا کر دی کہ آزاد رہتے ہوئے بھی یہ عقلاً غلام اور غلام چلے آ رہے ہیں۔''[۶]

مغربی ریشہ دوانیاں

مولانا رابع ندوی کو شدت کے ساتھ اس بات کا احساس تھا کہ مسلم دنیا خاص طور پر عالم عرب کے حالات کی خرابی اور ان کے مسائل ان کی اندرونی کمزوری کے ساتھ ساتھ بیرونی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے بھی ہیں۔ وہ پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں کہ یورپ کو مسلمانوں کے خلاف جب میدان جنگ میں کامیابی نہیں ملی تو اس نے فکری یلغار کے ذریعہ مسلمانوں کے ذہن و دماغ کو مسخر کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کے لیے اس نے ذرائع ابلاغ، تعلیم اور استشراق (یعنی مسلمانوں کے علوم حاصل کر کے انھیں مسلمانوں میں ذہنی تبدیلی لانے کے لیے استعمال کیا جائے) وغیرہ کو استعمال کیا۔ مولانا کے خیال میں مغرب نے مسلمانوں کے ایک طبقے میں یہ احساس پیدا کرنے میں بھی کسی حد تک کامیابی حاصل کر لی کہ دنیا پر یورپ کا غلبہ و استیلاء اس کے علمی تفوق کی وجہ سے ہے لہٰذا مسلمانوں کا یہ طبقہ بھی یہی سمجھنے لگا کہ مسلمانوں کی تعمیر و ترقی یورپ کی اندھی تقلید میں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت جلد مسلمانوں کی ایک ایسی نسل وجود میں آ گئی جو پوری طرح یورپ سے مرعوب تھی۔[۸]

مولانا رابع ندوی نے مسلمانوں کے خلاف مغربی ریشہ دوانیوں کے حوالے سے مستشرقین یورپ کا خاص مطالعہ کیا تھا۔ ان کے خیال میں بیشتر مستشرقین عیسائیت کے مبلغ تھے اور انھوں نے اسلامی علوم حاصل کر کے ان میں نقائص تلاش کرنے اور پھر انھیں موثر انداز میں پیش کرنے کا کام کیا ہے۔[۹] ایک جگہ مستشرقین کے ذریعے یورپی استعماری مقاصد کے بارے ان کی رائے مولانا نذر الحفیظ نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

''مستشرقین نے عالم اسلام کو تباہ و برباد کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس کے سہارے استعماری طاقتیں کامیاب رہیں۔ آج سے ایک صدی پہلے ان کا منصوبہ تھا کہ سب سے پہلے مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا جائے۔ وہ انھوں نے خلافت عثمانیہ کو ختم کر کے پورا کیا، پھر انھوں نے طے کیا کہ مسلمانوں کو سائنسی، صنعتی میدانوں میں ترقی نہیں کرنے دیں گے تا کہ وہ ہمیشہ مغربی ملکوں کے دست نگر رہیں، اسرائیل کے خنجر کو عرب ملکوں کے قلب میں گاڑ کر ہمیشہ ان کی طاقت کو کمزور کرتے رہیں گے، تیسری طرف صحیح آزادی سے ان کو محروم کر کے اپنے تیار کردہ حاکموں کو بطور ڈکٹیٹر ان پر مسلط کیا جائے گا۔ دینی بنیادوں پر جماعتوں کے قیام کو روکا جائے گا، ان کے اندر انتشار و اختلاف کو ابھارا جائے گا۔''[۱۰]

عالم اسلام اور خاص طور پر عرب دنیا کے حکمرانوں کی مغرب سے مرعوبیت..... خاص طور پر فلسطین کے تئیں ان کے رویے کو..... اور اس کے ساتھ حد سے بڑھی ہوئی وفاداری کو وہ افسوس ناک سمجھتے ہیں۔ اور اسے خود مسلم ملکوں کی سلامتی کے لیے خطرہ قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''عالم اسلام جس کے ممالک کو ہم آزاد سمجھتے ہیں دراصل آزاد نہیں ہیں، ہر ملک کسی نہ کسی بڑی طاقت سے وابستہ ہے، لیکن زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ وفاداری کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو غیرت و حمیت کے خلاف بلکہ ملکی و ذاتی مصالح کے بھی خلاف ثابت ہوتی رہتی ہے۔ فلسطینیوں کو ختم کرنے کے بعد قریب کے ملکوں کی سلامتی کا کیا اعتبار رہ جاتا ہے، یکے بعد دیگرے زد میں آسکتے ہیں۔''[۱۱]

مغربی منصوبوں کا ادراک

مولانا رابع ندوی کا تاریخ کا مطالعہ بہت گہرا اور وسیع تھا، ان کی عصری حسیت بھی ان کے تاریخی شعور کی دین ہے۔ ان کے تاریخ کے مطالعے نے انھیں اپنے حال کو سمجھنے اور مستقبل کی پیش بندی

میں کافی مدد کی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ تاریخ کے مطالعے اور حال کے تجزیے کے ذریعے مستقبل کے لائحہ عمل کی طرف رہنمائی کر دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''ضرورت ہے کہ ہم خوب صورت اصطلاحات اور پسندیدہ الفاظ اور دل کش انداز بیان سے ہی حقیقت کو سمجھنے میں مدد نہ لیں، بلکہ ماضی اور حال کے واقعات کی حقیقتوں کے گہرے مطالعے کے ذریعے غالب قوموں اور با اثر طاقتوں کے عزائم کو سمجھنے کی کوشش کریں اور ان عزائم کے تحت جو منصوبے ہو سکتے ہیں ان کو شروع ہی میں سمجھنے کی کوشش کریں تا کہ ان کے عمل میں آجانے اور نتائج ظاہر ہونے سے پہلے ان کا تدارک کریں اور اگر تدارک نہ کر سکیں تو کم از کم ان سے آگاہ ہو سکیں اور دوست دشمن میں فرق سمجھ سکیں۔ خاص طور پر دشمن اگر دوستی اور ہمدردی کے انداز اور اظہار کو اپنا طریقہ کار بنا رہا ہو۔''[۱۲]

مغربی منصوبوں کا ادراک زیادہ بہتر انداز میں عام مسلمان کیسے کر سکتے ہیں مولانا رابع ندوی اس جانب بھی رہنمائی کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''ضرورت ہے ہم ان دانش وروں کے مضامین اور کتابوں کا مطالعہ کریں جنھوں نے مغرب کے اس رویے کا گہرا مطالعہ کر کے اس کے مضر پہلو اور اس کے موثر نتائج کی نشان دہی کی ہے اور اب اس سلسلے کا اچھا خاصا لٹریچر تیار ہو چکا ہے اور مغربی ممالک میں آنے جانے والے یا وہاں کچھ وقت گزارنے والے حضرات ایک تعداد میں یہ کام انجام دے رہے ہیں۔''[۱۳]

مولانا رابع ندوی کو اس بات کا بخوبی ادراک تھا کہ مغرب مسلمانوں کو ذہنی و فکری غلامی میں مبتلا کر دینا چاہتا ہے چنانچہ اس حوالے سے وہ مغربی میڈیا کے رول کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جو ان کے مطابق مخرب اخلاق ہے۔ مولانا کے خیال میں مسلمان اقوام عالم کی مشترکہ دشمنی کا نشانہ اس لیے ہیں کہ ان کا مذہب اعلیٰ انسانی اخلاق کی دعوت دیتا ہے جب کہ مغربی اور ان کی ہم نوا دیگر اقوام تمام حدود و قیود سے آزادی چاہتی ہیں۔[۱۴] وہ میڈیائی کردار کشی کو ایک صیہونی سازش قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

اسلامی اقدار و تشخص کے ساتھ زندگی گزارنے کے متمنی مسلمانوں کے لیے بنیاد پرست کی اصطلاح کا استعمال اسی سازش کا نتیجہ ہے۔ان کے مطابق:

''جو شخص اللہ تعالی کی عبادت اور مذہبی فرائض کا التزام کرے اس کو بنیاد پرست کہہ کر مطعون کرتے ہیں، اس کو مذہبی ہٹ دھرمی کرنے والا شخص مراد لیتے ہیں اور اگر وہ اس طعنہ و زیادتی پر ناگواری ظاہر کرے تو اس کو دہشت گردی اور شدت پسندی کا الزام دیتے ہیں، بلکہ سنجیدگی کے ساتھ مذہب پر عمل کرنے والوں اور مذہبی اقدار و ثقافتی روایات کی حفاظت کرنے والوں اور دینی جوش و جذبہ سے سرشار افراد کو کھلے طریقے سے دہشت گرد قرار دیتے ہیں۔''[۱۵]

مسلمانوں کی کمزوریاں

ایک طرف مغرب اور اس کے ہم نواؤں کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیاں ہیں اور وہ اپنے ذرائع ابلاغ کے توسط سے ان کا پروپیگنڈا ابھی خوب کرتے ہیں تو دوسری طرف مسلمانوں کی سادہ لوحی ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات کو لے کر مستقبل کے فیصلے سنانے لگ جاتے ہیں۔مولانا رابع ندوی کے نزدیک مسلمانوں کی یہ کمزوری ہے اور اس میں عام مسلمانوں سے لے کر ان کے علماء و دانش وران سب شامل ہیں۔انھوں نے مثال دی ہے کہ پندرہویں صدی ہجری کا آغاز ہوا یا اکیسویں صدی عیسوی کی ابتدا دونوں موقعوں پر یہ غلغلہ اٹھا کہ یہ صدی اسلام کی صدی ہوگی اور دنیا کی قیادت دیر سویر مسلمان کریں گے، یا یہ کہ یہ اسلام کے عروج و غلبے کی صدی ہوگی اور یورپ ٹوٹ رہا ہے وغیرہ[۱۶] مولانا ندوی کو مسلمانوں کی اس ذہنیت سے شکوہ ہے خاص طور پر ان کی صحافت سے، چنانچہ لکھتے ہیں:

''اس سلسلے میں مسلمان صحافت نے بھی شور مچایا اور مسلمان تحریکوں نے بھی حصہ لیا، لیکن دیکھنے میں یہ آیا کہ مسلمانوں کا اس وقت مزاج کام کرنے سے زیادہ نام کرنے کا بن گیا ہے، وہ کام سے زیادہ کام کا تذکرہ، جدوجہد سے پہلے جدجہد کا اعلان اور پروگرام پر عمل کرنے سے قبل اس کا بے تحاشا اعلان اپنا وطیرہ

بنائے ہوئے ہیں، وہ اپنے مخالف کو اس کا مقابلہ کرنے سے قبل ہوشیار کر دیتے ہیں، اس کو شکست دینے کا اپنا طریقہ اور انداز کار بتا دیتے ہیں۔''[۱۷]

مولانا کا موقف یہ ہے کہ عام مسلمان اگر ایسا کرتے ہیں تو وہ قابل معافی ہو سکتے ہیں لیکن رہبران قوم وملت اگر ایسا کریں، جو وہ کرتے ہیں، تو یہ ٹھیک نہیں۔ مولانا کے خیال میں جن باتوں کا تذکرہ و چرچا کیا جانا چاہیے وہ یہ ہیں:

''اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان حالات کا چرچا کیا جائے جن میں انھوں نے دنیا کو اخلاق و انسانیت کا درس دیا اور قوموں اور نسلوں کو حیوانی زندگی سے نکال کر انسانی زندگی میں داخل کیا، انھوں نے مصیبت زدہ کو مصیبت سے نکالا، غلاموں کو ان کی حقیر پوزیشن سے نکال کر دوستانہ و مساویانہ پوزیشن میں پہنچایا، عورت کو ساز و سامان کی حیثیت سے نکال کر کامل انسانی حقوق کی مستحق اور رفیقہ حیات کا درجہ دیا، بچیوں کو عار و ذلت کا سبب سمجھ کر زندہ دفن کر دینے سے بچا کر نعمت اور باعث اجر و ترقی سمجھنے کا ذریعہ بنایا، انسان تو انسان ہے ہر ذی روح کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا سبق دیا۔''[۱۸]

اس میں شک نہیں کہ نئی صدی ہجری کا آغاز ہو یا نئی صدی عیسوی کا، دنیا کے مختلف مسلم سماجوں میں اسلامی بے داری دیکھنے کو ملی ہے۔ مولانا رابع ندوی کے خیال میں یہ ملی و اسلامی بے داری خوش آیند ہے البتہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس میں دکھاوا زیادہ اور حقیقی تبدیلی کم ہے۔ ذاتی مفادات اور خود غرضی ابھی بھی مسلم قیادت کی بڑی کمزوری ہے۔ چنانچہ اس کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس اسلامی لہر سے مسلمانوں کو مسرت بھی ہے اور توقعات بھی لیکن دوسری طرف ایک حقیقت اور بھی ہے جو خود مسلمانوں کے لیے نظر انداز کرنے کی نہیں ہے اور ان کی کسی ملی لہر کے کامیاب ہونے کے لیے اس حقیقت کا اعتراف اور اس کے مطابق ضروری عمل اختیار کرنا از حد ضروری ہے۔ وہ حقیقت ہے خود مسلمانوں کو اپنے اندر کی کمزوری اور ان کی زندگیوں میں اسلام کی تعلیمات اور احکامات پر عمل نہ کرنے کی عادت اس کمزوری کی

صورت میں مسلمان کی تلوار بجائے لوہے کے لکڑی کی ثابت ہوگی اس کی قوت بے تاثیر ثابت ہوگی۔ ہماری پوری ملت اس وقت اسلامی تعلیمات کے لحاظ سے ان تمام کمزوریوں میں مبتلا ہے جو مسلمانوں کے اعلیٰ مقاصد اور آرزوؤں کے ساتھ جوڑ نہیں کھاتیں۔ ہم خودغرضی اور ذاتی مفاد کی ترجیح میں اس طرح مبتلا ہیں جیسا کہ چھوٹے بچے مبتلا ہوتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے ذاتی فائدے کے لیے اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کے لیے ہم اسلامی قدروں کو بے تکلف قربان کر دیتے ہیں، اور قرآن وحدیث میں جن باتوں کو حرام کاموں میں شمار کیا گیا ہے اور جن پر وعیدیں آئی ہیں وہ ہمارے عمل میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ حصول مال میں حرام وحلال کی تمیز نہ کرنا، چھوٹے سے چھوٹے نجی فائدے کے لیے ملی مفاد کو قربان کر دینا، معمولی سے معمولی جاہ کے لیے سب کچھ کر ڈالنا، معمولی سے معمولی فائدے کے لیے جھوٹ بول دینا، دھوکہ دے دینا، دوسرے کے حق کو دبا لینا، اس کی اہانت کر دینا بلکہ اس کو شدید نقصان پہنچا دینا، جھوٹی عزت وشہرت کے لیے بے دریغ پیسہ خرچ کرنا اور خوب اسراف کرنا، ملت کے لیے تھوڑا خرچ کرنے میں بھی کوتاہی کرنا اور اتحاد واتفاق کو چند روز سے زیادہ نہ چلنے دینا، عام وطیرہ بنتا جا رہا ہے اور تمدن وعلم سے حاصل کردہ اپنی صلاحیتوں کے ذریعے سب کو سمجھا دینا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں ملت کے مفاد کے لیے اور اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کے مطابق ہی کر رہے ہیں۔''[19]

اس میں شبہ نہیں کہ پوری دنیا میں مسلمان ایک طرح کے حالات میں نہیں رہتے، خوش حالی و فارغ البالی کی آزمایشوں سے لے کر محرومی وفقر وفاقہ، اسی طرح بیرونی مداخلتوں سے لے کر آپسی رسہ کشی تک مختلف سطحوں پر مختلف طرح کے مسائل کا انھیں سامنا ہے۔ انھیں اپنے اسلامی تشخص کے لیے سخت جد وجہد کرنی پڑ رہی ہے البتہ ان میں کچھ کمزوریاں مشترک ہیں۔ مولانا رابع ندوی ان کی نشان دہی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''لیکن جو کمزوری ہر جگہ مشترک ہے وہ ذاتی اور گروہی خودغرضی، اتحاد و اتفاق کے بارے میں کوتاہی، گروہ بندیوں اور آپس کی کش مکش میں اپنی خاصی طاقتوں کا ضیاع ہے۔ اس کی وجہ سے دشمن کو کامیابی کی راہ ملتی ہے اور مقابلہ کی طاقت کمزور ہوتی ہے اور مظلوموں کی دادرسی نہیں ہو پاتی۔''[۲۰]

مسلمانوں کے کرنے کے کام

مولانا رابع ندوی اپنی صحافتی تحریروں میں مغربی استعمار کی ریشہ دوانیوں، مشرقی اقوام خاص طور پر مسلمانوں کے لیے ان کے مستقبل کے منصوبوں کی نشان دہی کے ساتھ مسلمانوں کی کمزوریوں کو بھی بیان کرتے ہیں۔ مولانا یہیں پر بس نہیں کرتے بلکہ مسلمانوں کے لیے بحیثیت ملت کرنے کے کام بھی شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ایک مضمون مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا؟ میں رہبران قوم وملت کو ان کی ذمہ داریاں ان الفاظ میں یاد دلاتے ہیں:

''اولا رہبران اخلاق و مذہب کی ذمہ داری ہے کہ خدا کا خوف دلائیں اور آخرت کی فکر سے ڈرائیں اور حالات کو بہتر بنانے کی طرف توجہ دلائیں۔ قائدین ملک کی ذمہ داری ہے کہ بگڑے ہوئے حالات کو درست کرنے کی کوشش کریں، اور ایسی زندگی استوار کرنے کی طرف توجہ کریں جس میں امن ہو، آپسی رواداری اور ہمدردی ہو، انسانیت کی قدروں کی پاسداری ہو، اور اپنے رب واحد کے احکام کی تابعداری، تاکہ ملک وملت چین وراحت، امن و خوش حالی سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہو اور صحیح انسانی معاشرہ قائم ہو سکے۔''[۲۱]

مسلمانوں کی ذمہ داریوں کے حوالے سے مولانا رابع ندوی کا یہ احساس ہے کہ سیاست و دعوت کی یکجائی ایک دشوار گزار کام ہے، اس کے باوجود یہ ضروری ہے۔ سیاست کئی بار ذاتی مفادات میں الجھا دیتی ہے اسی لیے دینی کوششوں کو سیاست سے الگ کرنے کی مثالیں بھی ہماری تاریخ وروایت میں موجود ہیں۔ البتہ تاریخی تناظر میں ان کا اپنا تجزیہ یہ ہے کہ دعوت وسیاست کا امتزاج ہی کامیابی کی طرف لے جاتا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''یہی وہ موڑ ہے جہاں دعوت وسیاست کا حسین امتزاج نظر آتا ہے اور یہ اسلام کا اعجاز ہے کہ تاریخ انسانی میں پہلی بار اسلام نے دعوت وسیاست کو میدان عمل کے گلدان میں سجا کر دنیا والوں کے سامنے ایک حسین گلدستہ پیش کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سیاست ودعوت کا امتزاج تاریخ انسانی میں پہلی بار ہوا جو ایک طرح سے نہایت دشوار ہے۔ کیونکہ سیاست کی بنیاد صرف حصول منفعت پر ہے اور دعوت کی بنیاد حصول منفعت سے قطع نظر صرف اخلاص پر ہے اسی وجہ سے اسلام میں سیاست ودعوت کو جدا نہیں کیا گیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کئی مرتبہ دانشوران سیاست ورہبران دعوت ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے ہیں۔''[۲۲]

مولانا رابع ندوی کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ اسلام دشمن طاقتیں فی الواقع اسلام کے تشخص اور امتیاز کو مٹا دینا چاہتی ہیں اور مسلمانوں کے لیے عہد حاضر کا سب سے بڑا چیلنج یہی ہے۔ وہ اس چیلنج سے نبرد آزما ہونے کو وقت کا اولین فریضہ قرار دیتے ہیں اور اس کے لیے دو طریقے تجویز کرتے ہیں:

''پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ دشمنوں کے ذہنی وفکری غلبہ وتسلط کا مقابلہ مادی وسائل وذرائع سے کیا جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی اساسی وبنیادی تعلیمات کو اس طرح جاگزیں کیا جائے کہ ان میں اسلام کی عطا کردہ تہذیب وتمدن، افکار ونظریات پر فخر کرنے کا جذبہ اس حد تک کارفرما ہو جائے کہ مسلم تعلیم یافتہ طبقہ دشمنان اسلام کی طرف سے ہونے والے ذہنی وفکری حملوں کو روکنے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے انھیں ٹھوس اور مضبوط بنیادوں پر محاذ آرا ہو۔''[۲۳]

نئی نسل سے امید

یہ حقیقت ہے کہ پچھلی چند صدیوں کے دوران یورپ نے علم وتحقیق کے میدان میں خاصی ترقی کی ہے اور اس بنا پر اسے دنیا کی بقیہ اقوام پر بالادستی بھی حاصل ہے۔ البتہ اس کی بالادستی اب روبہ زوال ہے اور دوسری اقوام بھی اب آگے بڑھ رہی ہیں۔ مسلم دنیا میں بھی اس تبدیلی کے رجحانات دیکھے اور محسوس کیے جاسکتے ہیں، خاص طور پر مسلمانوں کی نئی نسل سے مثبت تبدیلی کی امید حالیہ کچھ برسوں کے

دوران بڑھی ہے۔ عالم اسلام کے ایک واقف کار کے طور پر مولانا رابع ندوی اس مثبت تبدیلی کے رجحان سے بہت پرامید ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''مسلم ممالک نے بھی ہوش سنبھالنا شروع کر دیا ہے اور علمی و تجرباتی میدان میں جو انکشافات ہو گئے ہیں، وہ سب کی مشترکہ ملکیت بنتے جا رہے ہیں، اور مسلمانوں نے ماضی کے خطوط پر مستقبل کی راہیں تلاش کرنا شروع کر دیا ہے، ظلم و استبداد اور اہانت کے خلاف ان کے اندر ردعمل پیدا ہو چکا ہے جس کی وجہ سے ان کی رگوں میں بے داری کی لہر دوڑنے لگی ہے۔''[۲۴]

تبدیلی کے حوالے سے مولانا ندوی سب سے زیادہ پرامید ترکی سے نظر آتے ہیں۔ وہ گزشتہ صدی کے دوران وسطی ایشیا اور ترکی میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے جائزے کے ساتھ ترکی کی اسلام کی طرف واپسی کو مثبت پیش رفت قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''ترکی جہاں مصطفیٰ کمال کی کوششوں سے اسلامی تشخص کو بالکل ختم کر دیا گیا تھا، عربی زبان اور اسلامی ثقافت پر سخت پابندی لگا دی گئی تھی اور کئی دہائیوں کی کوشش سے ترکی قوم کی اسلامی وضع و اطوار ختم کر دیے گئے تھے، اور جہاں اذان عربی ختم اور نماز و دین داری ناپسندیدہ بنا دی گئی تھی اب پھر اسلام سے تعلق اور اسلامی شعائر سے دل چسپی کا آغاز ہو گیا ہے اور اپنے کو مسلمان کہنے اور سمجھنے میں جھجھک ختم ہوتی نظر آ رہی ہے، حکومت کے عہدہ دار تک اسلام سے ربط ظاہر کرنے میں عیب محسوس نہیں کرتے، اسلام پسندوں کی تعداد اس حد تک پہنچ گئی کہ ان کے ووٹوں نے اسلام پسند قائد کے لیے حکومت کا سربراہ بننے کی راہ ہموار کر دی اور اس طرح ترکی کا یہ مریض سخت جان پھر صحت و زندگی کی طرف لوٹتا معلوم ہوتا ہے۔''[۲۵]

مولانا رابع ندوی کی نوجوان مسلم نسل سے امیدان کے مطالعہ تاریخ کی بنیاد پر ہے خاص طور پر آغاز اسلام کی تاریخ میں جس جذبہ و ہمت کے ساتھ نوجوان قربانیاں پیش کرتے نظر آتے ہیں وہی

جذبہ وحوصلہ مندی مولانا رابع ندوی کو اپنے عہد کی نوجوان مسلم نسل میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی تمام تر امیدیں انھیں سے وابستہ کرتے ہیں:

> ''خوش آیند بات یہ ہے کہ پہلے اسلامی حمیت اور دین کا شوق صرف بڑی عمر کے مسلمانوں میں پایا جاتا تھا اور نوجوان نسل اپنے کو اس سے الگ رکھتی تھی، اور اپنی عمر کے تقاضہ کے مطابق ہی دل چسپی رکھتی تھی اب یہ ایک بات پیدا ہوئی ہے کہ اسلام اور اسلامیت کی حمیت نوجوان نسل کے لوگوں میں بھی خاصی نظر آرہی ہے، بلکہ ان کی عمر کے تقاضے کے مطابق جوش و ہمت اور قربانی کے جذبات کے ساتھ ان میں یہ رجحان بڑھ رہا ہے اس لیے جہاں جہاں اسلامیت کو دبانے اور روکنے کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہاں ایک مقابلہ اور ٹکراؤ کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے جو کہ زندگی کا ایک فطری عمل ہے اور زندگی کے باعزت بقا کے لیے اور حق بات کو اس کا حق دلانے کے لیے ضروری ہے۔''[۲۶]

خلاصہ کلام یہ کہ مولانا رابع ندوی کو جہاں ایک طرف یہ احساس اور ادراک ہے کہ مغرب اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ مشرقی اقوام کو ذہنی وفکری طور پر مستقبل میں بھی غلام بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ مغرب اس مقصد کے حصول کی خاطر ہر حربہ استعمال کرے گا اور کسی بھی حد تک جانے سے گریز نہیں کرے گا۔ ان کے سامنے اس طرح کی مغربی کوششوں کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ وہیں دوسری طرف ایک صحافی، داعی اور تاریخ کے طالب علم کے طور پر وہ مسلم دنیا کی نئی نسل سے پرامید بھی ہیں۔ انھیں لگتا ہے کہ مسلم دنیا میں بے داری کی جو نئی لہر پائی جاتی ہے اور جس کے تحت مسلمانوں کی نئی نسل مرعوبیت اور شکست خوردگی کے احساس سے نکل کر اپنی تعمیر وترقی کی نئی تاریخ لکھنے پر مصر ہے، وہ مستقبل میں مسلمانوں کو بلندی اور عروج کی طرف لے جائے گی اور مسلمان پھر ایک بار دنیا کی قیادت کے اہل ہوسکیں گے۔ مولانا کا یہ تجزیہ محض خوش گمانی نہیں ہے بلکہ وہ اس نتیجے تک اپنے مطالعے، عمیق مشاہدے اور وسیع تجربے کے سبب پہنچے ہیں۔ امید کی جانی چاہیے کہ مولانا ندوی کی پیش بینی ایک نہ ایک دن حقیقت کا روپ ضرور اختیار کرے گی۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ ندوۃ العلماء کا ماہانہ عربی رسالہ، اکتوبر ۱۹۵۵ء سے مسلسل شائع ہورہا ہے۔
۲۔ تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کا ترجمان ہے، اس کے افکار ونظریات اور عقائد کی ترجمانی کرتا ہے۔ ۱۰ر نومبر ۱۹۶۳ء کو پندرہ روزہ تعمیر حیات کی اشاعت کا آغاز ہوا۔
۳۔ پندرہ روزہ الرائد ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ۱۹۵۹ء سے پابندی سے شائع ہورہا ہے، مولانا رابع ندوی نے اسے جاری کیا تھا۔
۴۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ ۲۰۰۵ء
۵۔ ندوی، سید محمد رابع، عالم اسلام اور سامراجی نظام: امکانات اندیشے اور مشورے، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۰۵ء، ص: ۱۳
۶۔ ایضاً، ص: ۸۔۹
۷۔ ایضاً، ص: ۹
۸۔ ایضاً، ص: ۱۰
۹۔ ایضاً، ص: ۱۰
۱۰۔ ایضاً، ص: ۱۸
۱۱۔ ایضاً، ص: ۱۱۳
۱۲۔ ایضاً، ص: ۳۰۔۳۱
۱۳۔ ایضاً، ص: ۳۱
۱۴۔ ایضاً، ص: ۴۴
۱۵۔ ایضاً، ص: ۴۱۔۴۲
۱۶۔ ایضاً، ص: ۲۰۰
۱۷۔ ایضاً، ص: ۲۰۱
۱۸۔ ایضاً، ص: ۲۰۱
۱۹۔ ایضاً، ص: ۱۸۸۔۱۸۹
۲۰۔ ایضاً، ص: ۶۴
۲۱۔ ایضاً، ص: ۲۲۰
۲۲۔ ایضاً، ص: ۲۱۳
۲۳۔ ایضاً، ص: ۲۲۴۔۲۲۵
۲۴۔ ایضاً، ص: ۱۳۵
۲۵۔ ایضاً، ص: ۱۳۸۔۱۳۹
۲۶۔ ایضاً، ص: ۲۲۸

ابوالکلام قاسمی شمسی *

مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کا نظریۂ تعلیم

مولانا محمد علی مونگیریؒ کی ولادت ۱۸۴۶ء کو کانپور میں ہوئی۔ یہ زمانہ انیسویں صدی کا نصف آخر تھا۔ ان کی شخصیت گوناگوں صفات کی حامل تھی۔ ان کی شخصیت کی تعمیر میں کارفرما عوامل کا مطالعہ ضروری ہے۔ مولانا سید محمد الحسنیؒ تحریر کرتے ہیں:

> ''.....مولانا کی سیرت اور شخصیت کی تعمیر میں جو عوامل کارفرما تھے ان میں سے تین چیزیں بہت نمایاں ہیں، جن سے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔''[1]

مولانا مونگیریؒ کے عہد میں درس نظامی کا بول بالا تھا۔ باہمی نزاع، مناظرہ اور مجادلہ کی فضا قائم تھی۔ اس پرفتن دور میں مولانا نے اپنے آپ کو ان مسموم اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا۔ اس کی وجہ سے ان کی شخصیت غیر متنازع ہو کر لوگوں کے سامنے آئی۔ جس پر لوگوں کا اعتماد و بھروسہ تھا۔ سیرت مولانا محمد علی مونگیری کے مصنف تحریر کرتے ہیں:

> ''.....مولانا کے ذہن و نظر کی صفائی، سچائی اور سادگی اور جماعتی کشمکش سے

* سابق پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ (بہار) ای میل: abul.kalam.qsmi@gmail.com

ان کی علیحدگی میں ان کے خاندانی ماحول اور سوسائٹی کو بڑا داخل تھا وہ خوش قسمتی سے کسی ایسے گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو اس 'سرد جنگ' کا شکار ہو۔ ان کے آباء کرام، ان کے اساتذہ، ان کے ہم درس رفقاء بیشتر وہ لوگ تھے جن کو ان چیزوں میں غلو پسند نہ تھا، اور نہ وہ ان اختلافی مسائل سے کچھ زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔

ان کے بچپن کے ساتھی اور دوست مولوی امام علی ایک متقی اور صالح نوجوان تھے جن کو ان جھگڑوں سے کچھ سروکار نہ تھا، مفتی عنایت احمد کاکوروی اور مولانا لطف اللہ علی گڑھی کو درسی وتدریسی زندگی کی شبانہ روز مشغولیت سے اس کی فرصت نہ تھی کہ وہ ان چیزوں میں وقت ضائع کریں۔ مولانا لطف اللہ صاحب اپنے مرتبۂ علمی، افادۂ عام، اور شہرت کے باوجود بہت متواضع اور کریم النفس انسان تھے اور بہت معتدل جامع وصلح پسند طبیعت رکھتے تھے، انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کی تکفیر نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ ندوۃ العلماء کے قیام کے بعد وہ اس میں برابر شریک رہے اور اس کے متعدد سالانہ جلسوں کی صدارت کی۔ دوسری طرف ابتداء میں مولانا شاہ کرامت علیؒ اور اس کے بعد مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کی ارادت وبیعت نے اس کی توجہ ان مسائل کی طرف کم کردی۔''[۲]

انیسویں صدی کا عہد انگریزی حکومت کا زمانہ تھا۔ اس میں طرح طرح کے تغیرات سامنے آرہے تھے۔ جدید رجحانات اور جدید تقاضوں پر کام شروع ہو چکا تھا۔ مولانا نے ان کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ اس طرح ان کی شخصیت قدیم وجدید کا منبع بن گئی۔ خاص طور پر اس زمانہ میں عیسائیت کا زور تھا۔ انہوں نے عیسائیت کے بڑھتے سیلاب کو روکنے میں اہم رول ادا کیا اور عیسائی مشنریوں کا پوری طرح مقابلہ کیا۔ اس طرح انہوں نے مشنریوں کے طریقۂ کار اور جدید ذرائع ووسائل اور جدید تقاضوں کا مطالعہ کیا، اس مطالعہ نے ان کو قدیم وجدید کا مرکز بنادیا۔ سیرت

مولانا سید محمد علی مونگیریؒ میں مذکور ہے:

''جہاں تک جدید تقاضوں اور جدید رجحانات سے مولانا کی واقفیت کا تعلق ہے، اس میں بنیادی حصہ مولانا کے اس کارنامہ کا ہے جوانہوں نے عیسائیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے میں انجام دیا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور ڈاکٹر وزیرخاں کے بعد اس فتنہ کے سدباب کے لیے جو شخصیت سب سے زیادہ نمایاں ہوکر سامنے آئی وہ مولانا ہی کی شخصیت تھی۔ انہوں نے اپنے قلم اور زبان سے عیسائی مشنریوں کا پوری طرح مقابلہ کیا، اور اس طرح قدرتی طور پر مشنریوں کا طریقۂ کار اور جدید ذرائع وسائل کا استعمال، ان کی تکنیک علمی طور پر ان کے سامنے آئی اور انہوں نے دیکھا کہ یہ لوگ کن کن میدانوں میں کام کرتے ہیں اور کیا کیا ذرائع ووسائل کا استعمال، ان کی تکنیک علمی طور پر ان کے سامنے آئی اور انہوں نے دیکھا کہ یہ لوگ کن کن میدانوں میں کام کرتے ہیں اور کیا کیا ذرائع ووسائل استعمال کرتے ہیں۔ کانپور میں یتیم خانہ کا قیام، جہاں یتیم ولاوارث بچے تعلیم حاصل کرسکیں، اور عیسائیوں کے جال میں گرفتار نہ ہوں، اسی تجربہ اور مقابلہ کا نتیجہ تھا۔

حلقۂ درس سے نکل کر ان مشنریوں کا مقابلہ کرنے سے جدید طریقۂ کار اور جدید ذہن ومزاج کی ایک نئی دنیا مولانا کے سامنے آئی، ان کو نئے نئے تجربات حاصل ہوئے، بدلتی ہوئی دنیا کے مسائل سے واقفیت پیدا ہوئی، جن کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا مشنریوں کا خاص حربہ تھا اس کا علم ہوا، اور ان کمزوریوں کو دور کرنے کی طرف توجہ ہوئی۔ مشنریوں کے باہمی اتفاق، نرم رویہ، جذبۂ اتحاد اور دلآویز طرز عمل کا اندازہ ہوا، اس کے مقابلہ میں علماء کے درشت رویہ اور باہمی کشمکش کا منظر بھی سامنے آیا، رفتار زمانہ اور عصری مسائل سے مشنریوں کی واقفیت کے مقابلہ میں علماء کی علیحدگی

پسندی، قدیم پرستی اور بے خبری ظاہر ہوئی، اور اس بات سے مولانا کو یہ اندازہ ہوا کہ ہمارے نظام تعلیم میں ایک انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے اور جب تک یہ تبدیلی عمل میں نہیں آئے گی، مدارس کی موجودہ فضا اور حالات کے رخ میں بھی کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔''[۳]

مولانا کی شخصیت کی تعمیر میں تصوف وارشاد کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کا ذوق مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی صحبت سے حاصل ہوا۔ مولانا حسنی تحریر کرتے ہیں:

''تصوف وارشاد اور سلوک وتربیت کے ساتھ اس ذوق ورجحان کی پرورش میں مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے فیض صحبت وتربیت کا بڑا حصہ ہے۔ خوش قسمتی اور نعمت خداوندی تھی کہ مولانا محمد علی کو شیخ بھی ایسا ملا جس کا دامن منطق وفلسفہ کی آلودگیوں سے بالکل پاک تھا اور جس کے ذہن کی وسعت اور قلب کی فراخی کا یہ عالم تھا کہ اس نے سرسید احمد خاں کے لیے بھی جو اس زمانہ میں علماء ومشائخ میں مطعون تھے، تعریفی کلمات کہے اور حاجی وارث علی صاحب دیوی (جو اپنے خاص احوال وکیفیات اور بعض غیر شرعی اشغال کی وجہ طبقۂ علما میں ملعون تھے) کی مذمت بھی اپنی مجلس میں گوارا نہ کی۔''[۴]

مزید تحریر کرتے ہیں:

''یہی وجہ ہے کہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے تعلق سے ان کے ذہن ومزاج اور طرز فکر کو اور جلا ہوئی، اس صحبت نے ان کے حق میں دو آتشہ کا کام کیا، اور ان کو ان دونوں پہلوؤں کے جمع کرنے اور دونوں کے حدود سمجھنے میں بڑی مدد دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف انہوں نے ایک نئے نصاب درس اور طریقۂ تعلیم کا مکمل خاکہ پیش کیا جو اس عہد کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور ملت اسلامی کے نئے مسائل اور دشواریوں پر قابو پانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے، دوسری طرف وہ ایک مرشد روحانی اور مصلح ومربی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے جن کے ذریعہ ہزاروں

لاکھوں بندگان خدا کی اصلاح ہوئی اور جن کے فیض وتاثیر سے انسانوں کی کثیر تعداد فیضیاب ہوئی، عقل اور قلب کا یہ متوازن اور صحت مند اجتماع، باطنی کیفیات وحالات اور فکر ونظر کی وسعت وبلندی کا یہ کامیاب نمونہ اس دور آخر کی ایک نادر مثال ہے اور یہ مولانا محمد علی کا وہ امتیاز ہے جس نے ان کو ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں ایک منفرد جگہ عطا کی ہے اور ان کی شان کو دوبالا کر دیا ہے۔''[۵]

مولانا مونگیری نے جس وقت ہوش سنبھالا وہ انیسویں صدی کے نصف آخر کا زمانہ تھا۔ یہ وہ عہد ہے جس میں تازہ دم مغرب اور ضعیف وناتواں مشرق کی باہمی کشمکش اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اس عقلی وفکری کشمکش کے نتیجہ میں قدرتی طور پر بہت سی شخصیتیں پیدا ہوئیں جو مسلمانوں کے مختلف مکاتب خیال کی نمائندگی تھیں، متعدد تعلیمی اور اصلاحی تحریکیں انہیں اور انہوں نے اپنے اپنے دائرہ میں اسلام اور مسلمانوں کی قابل قدر اور ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔[۶]

مولانا مونگیریؒ کے عہد میں دو طرح کے نظام تعلیم رائج تھے، ایک کا ترجمان دارالعلوم تھا جو ۱۸۶۶ء میں قصبہ دیوبند میں قائم کیا گیا جس کا مقصد علوم اسلامیہ میں ماہر علماء کو میدان میں لانا تھا، جو صحیح عقیدہ کے محافظ بنیں اور اور ہندوستان میں خاص طور پر عیسائی مشنریوں کے ذریعہ دین اسلام پر کئے گئے اعتراضات کا جواب دیں، دین اسلام کی حفاظت کی کریں اور ہر محاذ پر دین کی خدمت انجام دیں، اسلام پر اندرونی وبیرونی حملوں سے بچائیں۔ کتاب وسنت پر استقامت اور اسلاف کے طریقۂ فکر اور طریقۂ تعلیم کی حفاظت ان کا شعار تھا، مغربی تہذیب اور نئے مسائل اور سوالات کی طرف ان کی توجہ کم تھی، ان کے اکابر کا خیال یہ تھا کہ آگے بڑھ کر حملہ کرنے کے بجائے قلعہ بند ہو کر اپنی حفاظت کی جائے اور اسی طرح طریقہ کو مضبوط کیا جائے۔ اسی فکر کے تحت دارالعلوم دیوبند اور اس کے مکتب فکر کے مدارس میں درس نظامی کا نصاب تعلیم رائج کیا گیا، جس میں معقولات کا غلبہ تھا، جس کے اکابر علمائے دیوبند مخالف تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ بھی فلسفہ یونان اور منطق وفلسفہ کے مخالف تھے وہ مولانا محمد علی مونگیریؒ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ان کو (مولانا احمد حسن کانپوری) مشغولی اور توغل معقولات کی طرف

بہت تھے، مناسب یہ تھا کہ الٰہیات کو معقولات پر غالب رکھتے، معقولات، کی شاخ فلسفہ و نیچریت ہے، جس طرح کہ علوم دین کی مزاولت سے انبیاء واولیاء کے قلوب کے انوار و برکات جو اس میں ہیں قلب پر اثر کرتے ہیں، اسی طرح جو لعوم کہ بے ۸ دینوں کے ہیں، ان کی ظلمت وتشویش اس میں ہے، وہ مزاولت سے قلب میں سرایت کرتی ہے۔''[۷]

اسی طرح مولانا رشید احمد گنگوہی کی رائے بھی تقریباً یہی تھی، ایک خط میں وہ اظہار رائے کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''فلسفہ محض بے کار امر ہے، اس سے کوئی نفع معتد بہ حاصل نہیں، سوائے اس کے کہ دو چار سال ضائع ہوں اور آدمی خرد ماغ، غبی دینیات سے ہوجائے، فہم کج اور کور فہم شرعیات سے ہوجائے اور کلمات کفریہ زبان سے نکل کر ظلمات فلاسفہ میں قلب کو کدورت ہوجائے اور کوئی فائدہ نہیں۔''[۸]

ان سب کے باوجود دارالعلوم دیوبند کا قیام جن مقاصد کے لیے آیا، وہ اس میں کامیاب رہا، دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس نظامیہ سے ماہرین علمائے کرام پیدا ہوئے، جنہوں نے قابل قدر و قابل ذکر خدمات انجام دیئے۔ مولانا حسنی تحریر کرتے ہیں:

''لیکن ان سب باتوں کے ساتھ اس حقیقت سے کوئی ہوشمند اور منصف انسان انکار نہیں کرسکتا کہ دیوبند کے فضلا نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے اور اس کو بدعت، تحریف اور تاویل سے محفوظ رکھا ہے، اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام اور بقاء واستحکام میں بیش قیمت مدد ملی ہے اور آج جو صحیح اسلامی عقائد، دینی علوم، اہل دین کی وقعت اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے اس میں بلاشبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے، اگر چہ زمانہ کے تغیر پذیری نئے نئے خطرات اور مسائل میں روز افزوں ترقی، اور الحاد

وبے دینی کی اشاعت، نیز وطنیت اور قومیت اور مغربیت واشتراکیت کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کی بنا پر مغربیت ومادیت کی طوفانی لہری عام مسلمانوں کے سروں سے گزر کر ان قلعوں کی دیواروں سے بھی ٹکرانے لگی ہیں، جن کو اب تک محفوظ اور اس نئے طوفان کی دسترس سے بہت دور سمجھا جاتا تھا۔''[۹]

درس نظامی کا نصاب تعلیم ابتدائی مرحلہ میں اردو اور فارسی وابتدائی عصری مضامین جو آٹھ سال پر مشتمل تھا، ان کو اہل مدارس نے ختم کر دیا اور یہ مشہور کر دیا گیا کہ درس نظامی آٹھ سال پر مشتمل ہے، جبکہ یہ آٹھ سال عربی درجات کے لئے ہیں، ابتدائی درجات کی تعلیم کو ختم کرنے کا بُرا نتیجہ یہ ہوا کہ درس نظامی کے فارغین عصری علوم وفنون کی ابتدائی تعلیم سے بھی محروم ہو گئے۔ وہ فاضل تو ہو جاتے ہیں، مگر کہیں پر اپنا نام ہندی یا انگریزی میں نہیں لکھ سکتے، یہ نہایت ہی افسوس کی بات ہے۔

دوسرا مکتب فکر سرسید احمد خان کا تھا۔ سرسید احمد خان کا خیال تھا کہ اپنے عقیدہ کو عزیز رکھو، مغربی تہذیب کے رنگ میں پوری طرح رنگ جاؤ، فاتح قوم کی تمام خصوصیات وصفات پیدا کر لو، خواہ معاشرت ہو یا سیاست، نظام تعلیم ہو یا نظام تربیت، انفرادی زندگی ہو یا قومی زندگی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی رائے یہ تھی کہ تہذیب وتمدن، اخلاق معاشرت، افکار وخیالات میں مغرب کی پیروی کرو، اس کے لئے انہوں نے انگریزی زبان وادب، سائنسی علوم وفنون اور جدید نظریات کے مطابق اپنے افکار ونظریات کو ڈھالنے کے لئے لوگوں کو متوجہ کیا۔ اور علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جو آگے چل کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہوا۔

ان کے علاوہ دیگر حضرات بھی تھے جنہوں نے جدید نظریات تعلیم پیش کئے، لیکن وہ بھی سرسید احمد خان صاحب کے نظریات سے قریب تھے، اس طرح وہ دور قدیم وجدید کے کشمکش سے دوچار تھا۔

مولانا سید محمد الحسنی تحریر کرتے ہیں:

''قدم قدم پر قدیم وجدید کی کشمکش تھی، ایک سرے پر وہ طبقہ تھا جو ہر جائز کو ناجائز سمجھتا تھا اور دوسرے سرے پر وہ طبقہ تھا جس نے ہر ناجائز کو جائزہ

رکھا تھا۔ بقول اکبرالہ آبادی:

ادھر یہ ضد ہے کہ لیمنڈ چھو نہیں سکتے
ادھر یہ ہٹ ہے کہ ساقی صراحی مے لا

بدلتی ہوئی دنیا اور سیاسی واجتماعی انقلابات سے متاثر ہوکر ایک بہت بڑے طبقہ نے ان تمام تغیرات کو جوں کا توں قبول کر لینا سب سے بڑی مصلحت اور دین کی خدمت سمجھتی تھی۔ دوسرا طبقہ جو شاید اس سے بڑا تھا ان مسائل سے پہلوتہی اور چشم پوشی پر قانع اور مطمئن تھا، نہ اس کو مستقبل کے اس عظیم ترین خطرہ کا پورا احساس تھا، نہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے وافر سامان۔

امت دو گروہوں میں منقسم ہوگئی تھی۔ ایک گروہ وہ تھا جس کو قدیم فلسفہ کے بے معنی اور لغو اور گمراہ کن مفروضات محض اس لیے گوارا تھے کہ ان پر قدامت کی چھاپ تھی اور بہت سے مفید ونافع علوم صرف اس لیے نا قابل قبول تھے کہ ان پر جدت کا الزام تھا۔ دوسرا گروہ وہ تھا جس نے قرآن وحدیث، وفقہ تفسیر اور اسلامی تاریخ کو بھی منطق وفلسفہ اور ہیئت وہندسہ کی طرح قصۂ پارینہ سمجھ لیا تھا، قدیم وجدید کا یہ زبردست اور عمومی مغالطہ ملک کے طول وعرض پر محیط تھا، اور ہر خاص وعام اس میں گرفتار تھا، کسی کو اس کا ہوش نہ تھا کہ وہ اس مسئلہ کو عام روش سے ہٹ کر سوچے اور اس کو کوئی حل پیش کرے۔[۱۰]

ایسے وقت میں ایک ایسے انسان کی ضرورت تھی جس کی نگاہ قدیم وجدید کی تقسیم سے بالاتر ہو جس کو نہ حلقۂ مدارس طرح جدید سے کوئی نفرت اور ہر قدم سے محبت ہو اور نہ جدید طبقہ کی طرح وہ مغرب کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو اور نہ اندھی تقلید کا شکار ہو، وہ زمانہ نبض شناس ہو۔ وہ ملک کی سیاسی وسماجی تغیرات اور تجربات سے فائدہ حاصل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہو، جس میں ایمانی فراست بھی ہو، فہم وتدبر بھی، قدیم وجدید افکار کا سنگم بھی ہو، قرآن وحدیث کا ماہر بھی ہو، مذکورہ صفات کی حامل شخصیت انیسویں صدی کی آخر میں مولانا محمد علی مونگیری کی صورت میں جلوہ گر ہوئی، جنہوں نے قدیم وجدید کی کشمکش کی کھائی کو پاٹنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کو لکھنؤ کو شہر میں قائم کیا جس سے نئی نسل کی تعلیم وتربیت میں نمایاں کردار پیش کیا اور آج بھی اس کا فیض جاری ہے۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ کے تعارف نامہ میں تحریر ہے:

''۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں ایسے ماحول میں ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا جب ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت قائم ہوچکی تھی، اور عیسائی مشنریاں آزادانہ طور پر مسیحیت کی دعوت دے رہی تھیں اور پورے ملک میں گھوم پھر کر اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کر کے غیر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی مہم زور وشور کے ساتھ جاری تھی، ایک طرف یہ ہورہا تھا، دوسری طرف ہمارے علماء کا فروعی مسائل میں اختلاف کا یہ عالم تھا کہ کبھی تو مقدمہ کی نوبت آجاتی اور علماء غیر مسلم ججوں کے سامنے کھڑے ہوتے اور بخاری ومسلم اور دیگر کتب حدیث ان ججوں کے نیچے ڈھیر ہوتیں۔

انگریزوں کے لائے ہوئے غیر اسلامی نظام تعلیم کے اثر سے مسلمان قدیم وجدید کے دومتوازی طبقوں میں تقسیم ہوگئے تھے، ایک طرف علمائے دین تھے جو عربی مدارس سے قدیم طرز پر پڑھ کر نکل رہے تھے، دوسری طرف مغربی تعلیم یافتہ حضرات جو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروردہ تھے، ان دونوں کے درمیان اجنبیت اور بے گانگی کی خلیج تھی جو دن بہ دن بڑھتی جارہی تھی، علماء مسلم معاشرہ کی پاسبانی ونگرانی اور مغربی علوم کے حملوں اور اس کے تشکیکی اثرات سے مسلمان نوجوانوں کی حفاظت میں سخت دشواری محسوس کررہے تھے اور تعلیم یافتہ طبقہ مغرب کے غاشیہ برداروں اور فکری وتہذیبی شکست کے نقیبوں کے اثر کا شکار ہوتا جارہا تھا، غرض کہ قوم کا ایک بڑا حصہ ان دونوں طبقوں کے درمیان ہچکولے کھا رہا تھا، جس میں سے ایک طبقہ قدیم طرز تعلیم اور مسلک سے کسی فروعی اختلاف کو ابھی ایک قسم کی تخریب اور ضلال سمجھتا تھا، دوسرا طبقہ مغرب سے آنے والی ہر چیز کو عظمت وتقدس کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اس کو ہر عیب ونقص سے پاک سمجھتا تھا، یہاں تک کہ اہل مغرب کے افکار اور فکری رجحانات بھی اس کو عظمت اور علمیت کا پیکر نظر آتے تھے اور ان کو وہ ذہن انسانی کی پرواز کی آخری منزل تصور کرتا تھا، ان دونوں طبقوں کے درمیان جو فکری تضاد تھا اور جس طرح وہ دو انتہائی سروں پر تھی۔ ان حالات کا عطر وخلاصہ جن سے ملت اسلامیہ ہند یہ گزر رہی تھی، انہیں حالات میں ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں ایک ہمہ گیر علمی ودینی تحریک کی حیثیت سے ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا،

اس تحریک نے بہت قلیل عرصہ میں پورے ملک کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی، ندوۃ العلماء کے جلسے، جس شان وشوکت کے ساتھ ہوتے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس تحریک کی جڑیں اندرون ملک کتنی گہری اور اس کا دائرۂ کار اور حلقۂ اثر کتنا وسیع تھا، یہ تحریک چند بنیادی مقاصد کے لیے سرگرم تھی، جن میں سے چند چیزیں یہ تھیں:

- علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔
- اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا، نزاع باہمی کے فتنہ کو ختم کرنا۔
- اسلامی تعلیمات کی اشاعت بالخصوص برادران وطن کو اس کی خوبیوں سے واقف کرانا، ان کے سامنے اس کی ہمہ گیری اور پوری انسانی برادری کے لیے باعث رحمت بتانا اور اسلام سے ان کی وحشت کو دور کرنا۔[11]

اس تحریک کے بانی حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ تھے۔ ندوۃ العلماء کے مقاصد کی ترویج واشاعت کرنے والے ملک کے مشہور علمائے کرام تھے ان میں استاذ العلماء مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا عبدالحق حقانیؒ، مولانا عبداللہ انصاریؒ، مولانا سید محمد شاہ محمد رامپوریؒ، مولانا محمد فاروق چریاکوٹیؒ، مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوریؒ، مولانا محمد ابراہیم آرویؒ، مولوی رحیم بخشؒ، مولانا احمد حسن کانپوریؒ، مولانا شاہ سلیمان پھلواریؒ، مولانا ظہور الاسلام فتحپوریؒ، شاہ محمد حسن الہ آبادیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن شیروانیؒ (سابق صدر الصدور امور مذہبی، حیدر آباد، دکن) مولانا ابوالکلام آزادؒ اور منشی اطہر علی کاکوریؒ، مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنیؒ و مولانا فتح محمد تائب لکھنویؒ وغیرہ۔

ان بزرگوں کا پختہ عقیدہ تھا کہ اسلام ایک عالمگیر اور ابدی دین ہے، رہتی دنیا تک انسانوں کی رہنمائی اور اس کی دنیاوی اور اخروی کامیابیوں کا ضامن ہے، اور اس میں زندگی کے ہر شعبہ کے لیے رہنمائی اور ہر مشکل کا حل موجود ہے، اس لیے ذہن انسانی کے ارتقاء وتنزل واور اس کے تغیرات کی مختلف منزلوں سے اس کا سابقہ پڑنا، بدلے ہوئے حالات اور افکار میں رہنمائی کا فرض انجام دینا اور ہر دور میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کو رفع کرنا اس کے لیے ایک قدرتی امر ہے، ایسے جامع ہمہ گیر اور جاوداں دین کے داعی اور اس کی تفہیم وتبلیغ کرنے والے افراد پیدا کرنے کے لیے ایسا نظام اور نصاب تعلیم مرتب کیا جانا چاہئے جس کا دائرہ برابر وسیع ہوتا رہے، جو ہر دور میں بدلتے ہوئے حالات کے

تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا اور زندگی کا ثبوت دیتا رہے، نظام تعلیم اسی وقت مفید اور کارآمد ہوسکتا ہے، جب وہ قدیم وجدید دونوں خوبیوں کا جامع ہو، اصول ومقاصد میں سخت اور بے لوچ، فروعی مسائل میں وسیع اور لچکدار ہو، ترقی پذیر ہو، زمانہ کی تبدیلیوں اور تقاضوں کے مطابق (اپنی روح، مقاصد اور اساسی علم کی حفاظت کے ساتھ) بدلتا اور ترقی کرتا رہے، یہ وقت کی اہم ضرورت تھی اور اسی میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کا حل پوشیدہ تھا۔

ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں نے محسوس کیا کہ یہ ضرورت اسی وقت پوری ہوسکتی ہے جب ایک مثالی مدرسہ قائم کیا جائے، جس میں ایسے علماء تیار کئے جائیں جو بنیادی دینی علم میں مہارت کے ساتھ اپنے دور کے تقاضوں کو بھی سمجھتے ہوں، قدیم علوم میں رسوخ کے ساتھ جدید ذہن کے شکوک وشبہات دور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، جو ایک طرف عقائد وعبادات میں ایک اٹل پہاڑ، اور دوسری طرف علم وتحقیق اور پیش بینی میں ایک رواں دواں اور شیریں چشمہ ہوں، ایک طرف نصوص دین اور اس کی عزیمتوں کے لیے سرحد کے محافظ اور امانت کے نگراں ہوں تو دوسری طرف دین کی تبلیغ وفہیم کے سلسلے میں پرجوش مجاہد اور جدید ترین ذرائع سے لیس ہوں، جہاں دین کے حقائق ومقاصد کے بارے میں مصالحت یا نرمی کے روادار نہ ہوں، وہاں عصر جدید کے جائز تقاضوں کو پورا کرنے میں کسی جمود وتعطل کا بھی شکار نہ ہوں۔[۱۲]

مذکورہ بالا افکار کے مطابق ۱۸۹۸ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی بنیاد رکھی گئی۔ دارالعلوم کے لیے ایک جامع اور متوازن نصاب تعلیم مرتب ہوا، جس میں ایک طرف تو علوم دینیہ میں پختگی اور دوسری طرف عربی زبان وادب میں مہارت اور تیسری طرف علوم جدیدہ سے حسبِ ضرورت واقعیت کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے اس کی تعمیر وترقی میں ممتاز اہل علم اور صاحب فکر حضرات نے حصہ لیا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مدت تعلیم چار مرحلوں میں منقسم ہے۔

پہلا مرحلہ ۶ رسال، ابتدائی (معہد) اس میں پرائمری سے قبل ایک سال چھوٹے بچوں کے لئے، پھر پانچ سال پرائمری کے ہوتے ہیں۔ ان میں بچوں کو مادری زبان اور بنیادی تعلیم دی جاتی ہے اور گورنمنٹ اس کول کے معیار کے مطابق رائج الوقت مضامین مع ہندی وانگریزی پڑھائے جاتے ہیں۔

دوسرا مرحلہ ۵؍سال (معہد) کا ہے۔ جو پانچ ثانوی درجات پر مشتمل ہے اور عصری درسگاہوں کے معیار کے لحاظ سے مڈل اور ہائی اسکول کی سطح کے مطابق ہے۔ اس میں عربی اور علوم اسلامیہ کے علاوہ انگریزی اور جنرل سائنس ہائی اسکول کے معیار تک دی جاتی ہے۔

تیسرا مرحلہ ۴؍سال۔ یہ کلیہ کہلاتا ہے۔ یہ چار تعلیمی برسوں پر مشتمل ہے جو تعلیمی سطح کے لحاظ سے عصری درسگاہوں کے اثر اور بی اے کے مطابق ہے۔ اس میں عربی ادب اور حدیث وفقہ وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ انگریزی تعلیم کا بھی انتظام ہے جس کا معیار بی اے تک ہے۔ اس سے فراغت پر عالیہ کی سند دی جاتی ہے۔

چوتھا مرحلہ درجات علیا ہے۔ یہ خصوصی شعبہ ہے، اس میں تخصص کی تعلیم دی جاتی ہے، اس کا نصاب ۵؍سال پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ قدیم وجدید کا سنگم ہے، اس میں علوم اسلامیہ کے ساتھ علوم عصریہ کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس طرح اس کے فارغین بی اے معیار تک کی تعلیم ندوہ کے نصاب ہی سے حاصل کر لیتے ہیں، اور علوم عصریہ میں بھی، یہی وجہ ہے کہ ندوہ کے فارغین کالج، یونیورسٹی اور بڑے بڑے ثقافتی اداروں میں تراجم کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ اس کی وجہ سے مدارس کا وقار بلند ہوا ہے۔

ندوۃ العلماء کے تعارف میں مذکور ہے:

> اللہ کا شکر ہے کہ ندوۃ العلماء نے اپنی عمر کے سو سال بخیر وخوبی پوری کر لئے، اس ایک صدی کی مدت میں دارالعلوم ندوۃ العلماء نے بڑی اہم اور قیمتی دینی وعلمی خدمات دیں، قدیم وجدید کی کشمکش کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی اور ندوی فضلاء مسلمانوں کے ان دونوں طبقوں کے درمیان باہمی تعارف وتعاون کا سبب بنے، انہوں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ دنیا سے الگ تھلگ نہیں رہتے ہیں اور نہ زندگی کے سمندر میں کسی جزیرہ پر پناہ گزیں ہیں، چنانچہ ان میں ادباء، محققین، ملکی زبان میں لکھنے والے اور معاشرتی رہنما بھی ہوئے جو زندگی کی سرگرمیوں میں برابر

شریک رہے، ان میں بعض ایسے بھی ہوئے جنہوں نے مسلمانوں کی نئی نسل کے لیے ایک پورا کتب خانہ تیار کر دیا، اور تن تنہا وہ خدمات انجام دیں اور اللہ کے فضل وکرم سے یہ سلسلہ روز افزوں ترقی پر ہے، ملک کے علمی اور زندگی کے اکثر شعبوں میں اس وقت ندوۃ العلماء کے فضلا دینی وعلمی امتیاز کے ساتھ پہچانے جاتے ہیں اور بیرون ملک متعدد ممالک اسلامیہ میں اسلامی اداروں اور یونیورسٹیوں میں دینی وعلمی خدمات دے رہے ہیں۔[۱۳]

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ایک اور ادارہ کا قیام عمل میں آیا، ابتدا میں اس کی بنیاد درس نظامی پر رکھی گئی، پھر ۱۹۲۰ء کے بعد اس میں بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے انداز پر دینی وعصری علوم پر مشتمل نصاب تعلیم جاری کیا گیا، وہ ادارہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ ہے، جس کا قیام ۱۹۱۲ء میں عمل میں آیا اور ۱۹۱۹ء میں حکومت کی تحویل میں دے دیا گیا۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ء میں اس میں سرکاری تحویل میں درس وتدریس کا کام شروع ہوا۔[۱۴]

اس کا نصاب تعلیم مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی وغیرہ مستند وجید علمائے کرام نے مرتب کیا۔ نصاب تعلیم کو مرتب کرنے کے بعد مولانا سید مناظر احسن گیلانی تحریر کرتے ہیں:

''نتیجہ یہی ہوا کہ تحتانی کلاسوں کی چند جزوی ترمیمات کے سوا مخالفین کی اس مطلوبہ کمیٹی کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بحمداللہ وہ نصاب اپنے موجودہ حال میں جاری ہے اور انشاءاللہ پچیس تیس سال کے اندر ہندوستان کو ماننا پڑے گا کہ اسلامی علوم کے سلسلے میں بہار کا قدم تمام صوبوں سے آگے ہے، بشرطیکہ اس نصاب کو ان ہی شرائط کے ساتھ پڑھا جائے جو تدریس کے لوازم ذاتی ہیں''۔[۱۵]

مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے سرکاری تحویل میں دینے کے بعد۱۹۲۲ء میں بہار مدرسہ ایکزامنیشن بورڈ کا قیام عمل میں آیا، اس سے بہت سے مدارس ملحق کئے گئے۔ بہار مدرسہ بورڈ سے ملحق مدارس میں بھی مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے نصاب کو جاری کیا گیا۔ ۱۹۷۸ء میں بہار مدرسہ بورڈ کے نصاب تعلیم کی جدید کاری گئی اور بہار مدرسہ بورڈ کو اپ گریڈ کر کے بہار اسیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ بنا دیا گیا، اور اس میں جاری نصاب تعلیم کو مساوات کا درجہ دیا گیا۔ تقرری کے لئے بھی اور داخلہ کے لئے بھی۔ اس کا نصاب تعلیم جدید سے جدید تر ہے۔ درجات بھی مرحلہ وار ہیں۔ نصاب تعلیم اور مساوات کا خاکہ درج ذیل ہیں۔

تحتانیہ	۴رسال	پرائمری
وسطانیہ	۴رسال	مڈل
فوقانیہ	۲رسال	میٹرک
مولوی	۲رسال	آئی اے
عالم	۳رسال	بی اے آنرس
فاضل	۲رسال	ایم اے

مضامین کا خاکہ پیش ہے۔

تحتانیہ: (۱) دینیات، (۲) ابتدائی عربی، (۳) مادری زبان اردو (۴) فارسی (۵) حساب، (۶) مطالعہ سماج، (۷) معلومات عامہ، (۸) انگریزی (۹) ہندی

وسطانیہ: دینیات، عربی ادب، نحو وصرف، اردو، ہندی، فارسی، انگریزی، حساب، مطالعہ سماج، معلومات عامہ، تاریخ اسلام، تاریخ ہند، ابتدائی منطق فقہ۔

فوقانیہ: ترجمہ قرآن مجید، حدیث شریف، فقہ، عقائد، نحو، ادب عربی وانشاء، منطق، فلسفہ، تاریخ اسلام، تاریخ ہند، جغرافیہ، حساب، انگریزی، فارسی یا اردو

مولوی: ترجمہ قرآن مجید، مشکوٰۃ شریف، شرح وقایہ اول، ہدایہ ثانی، اصول الشاشی، شرح فقہ اکبر (ملاعلی قاری) سراجی، حماسہ، متنبیؔ، مقامات حریری، تلخیص المفتاح، عروض، قطبی، ہدیہ سعیدیہ، انگریزی، فارسی یا اردو

عالم اور فاضل: مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے نصاب کے مطابق۔[۱۶]

ایک سو سال پر مشتمل اس نصاب تعلیم کا پانچ دہائیوں تک کا افادی پہلو جاری رہا۔ اس نصاب تعلیم کے مطابق مدارس ملحقہ کے فارغین ۱۹۶۰ء تک اکثر صاحب صلاحیت حضرات پیدا ہوئے۔ ان میں علما بھی ہیں، پروفیسر اور دانشور بھی۔ اس کے بعد اس میں معیاری تعلیم میں دھیرے دھیرے کمی آنے لگی، دینی تعلیم کا رجحان کم ہونے لگا، اب تو حالت ناگفتہ بہ ہے۔ نہ تو دینی تعلیم میں پختگی ہے اور نہ عصری علوم میں مہارت۔ غرض ۱۰۰ر مکمل ہوتے ہوتے یہ نصاب تعلیم عصری تعلیم تک سمٹ کر رہ گیا۔ اس کی وجہ جو بھی ہو، اس پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے، مگر اللہ کا شکر ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا معیار ابھی بھی باقی ہے۔

خلاصہ یہ کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ دینی اور عصری علوم و فنون کا سنگم ہے۔ اس نے سو سال کامیابی کے ساتھ گزار دیئے۔ اللہ کا فضل ہے کہ یہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ یہ بانیوں کے خلوص کا نتیجہ ہے۔ اللہ اس کو شر اور فتنہ سے محفوظ رکھے۔ اس ادارہ میں صرف کلیہ تک کی تعلیم کا انتظام ہے، جبکہ جامعہ تک اپ گریڈ کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ حکومت کی جانب سے پرائیویٹ یونیورسٹی کی منظوری کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے، بانیان ندوہ کے خواب کی تعبیر کی تکمیل کے لیے جامعہ ندوۃ کا قیام وقت کی اہم ضرورت ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کو ڈیمڈ یونیورسٹی کے طور پر منظور کرانے کے لیے منصوبہ سازی کی ضرورت ہے۔ توقع ہے کہ ندوہ کے ارباب حل وعقد ندوہ یونیورسٹی کے لیے لائحہ عمل تیار کریں گے تاکہ اس ادارہ کے فارغین کو مزید آگے بڑھنے کے مواقع حاصل ہوسکیں۔

مولانا سید محمد علی مونگیریؒ بن سید عبدالعلی بن سید غوث علی کا تعلق سادات بارہہ سے تھا جو تقریباً تین سو برس پہلے ملتان سے آئے اور مظفرنگر کے قصبہ کھتولی کے قریب قیام فرمایا۔ حضرت مولانا کے جدامجد سید شاہ غوث علی مظفرنگر سے کانپور تشریف لے گئے اور وہیں سکونت پذیر ہوگئے۔ وہیں مولانا سید محمد علی کی ولادت ہوئی۔ ۹ر ربیع الاول ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۳ر ستمبر ۱۹۲۷ء کو بعد نماز ظہر انتقال ہوا اور خانقاہ رحمانی میں مدفون ہوئے۔[۱۷]

ماخذ ومراجع

۱۔ سیرت مولانا محمد علی مونگیر،ص۱۰۱
۲۔ ایضاً،ص۱۰۲
۳۔ ایضاً،ص۱۰۴
۴۔ ایضاً،ص۱۰۴
۵۔ ایضاً،ص۱۰۶
۶۔ ایضاً،ص:۷۵
۷۔ کمالاتِ محمدیہ،ص:۳۵-۳۴
۸۔ سوانح قاسمی جلد دوم،ص:۲۹۲
۹۔ سیرت مولانا محمد علی مونگیری،ص:۷۸
۱۰۔ ایضاً،ص:۱۰۰-۹۹
۱۱۔ تعارف ندوۃ العلماء لکھنؤ،ص:۴۔۳
۱۲۔ ایضاً،ص:۵
۱۳۔ ایضاً،ص:۷
۱۴۔ ماخوذ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ
۱۵۔ حیاتِ سجاد،ص:۳۶،تاریخ مدرسہ بورڈ،ص:۱۵۱
۱۶۔ تاریخ مدرسہ بورڈ،ص:۱۵۷،مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ،ص:۵۸
۱۷۔ تذکرہ علمائے بہار،(جلد اول)ص:۲۸۹

شاہ احمد حسین جعفری کریمی *

امام شاہ ولی اللہ دہلوی

حضرت مجدد الف ثانی کی وفات کے ۸۰ سال بعد اور عالم گیر اورنگ زیب کی وفات سے چار سال پہلے نواح دہلی میں شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے۔ ایک طرف ان کے زمانے اور ماحول کو اور دوسری طرف ان کے کام کو جب آدمی بالمقابل رکھ کر دیکھتا ہے تو عقل حیران رہ جاتی ہے کہ اس نازک عہد میں غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل یہ شخص کیسے پیدا ہو گیا۔

فرخ سیر، محمد شاہ رنگیلے اور شاہ عالم کے تاریک زمانے میں نشو ونما پا کر ایسا مفکر اور عبقری منظر عام پر آتا ہے جو اپنے ماحول اور زمانے کی ساری بندشوں سے علاحدہ ہو کر سوچتا ہے۔ اندھی تقلید اور صدیوں کی قائم عصبیتوں کے قید و بند توڑ کر ہر مسئلہ زندگی پر محققانہ و مجتہدانہ نگاہ ڈالتا ہے اور ایسا لٹریچر چھوڑ کر جاتا ہے جس کی زبان، اندازِ بیان، خیالات، نظریات، کسی چیز پر بھی ماحول کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی تصنیفات کی ورق گردانی کرتے ہوئے یہ گمان نہیں ہوتا کہ یہ کتابیں اس جگہ لکھی گئی تھیں جس کے گرد و پیش خود غرضی، قتل و غارت، ظلم و ستم، انتشار و بدامنی کا بازار گرم تھا۔

شاہ ولی اللہ، انسانی تاریخ کے ان مفکروں میں سے ہیں جو خیالات و نظریات کے الجھے ہوئے

جنگل کو صاف کر کے فکر ونظر کی ایک سیدھی شاہراہ بناتے ہیں اور طبیعتوں میں حالات حاضرہ کے خلاف ایسی بے چینی اور تعمیر نو کا ایک ایسا دل آویز نقشہ پیدا کر کے چلے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ناگزیر طور پر تخریب فاسد وتعمیر صالح کے لیے ایک بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے مفکر اپنے نظریات کے مطابق خود کوئی تحریک اٹھاتے ہوں اور بگڑی ہوئی بھٹکتی دنیا کو اپنے ہاتھوں سے سنوارنے کے لیے میدان میں نکل آتے ہوں، تاریخ میں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اس طرز کے قائدین کا اصلی کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تنقید سے سیکڑوں برس کی قائم غلط فہمیوں کی اصلاح کر دیتے ہیں، ذہنوں میں اپنی جودت طبع سے نئی روشنی پیدا کر کے زندگی کے بگڑے ہوئے مگر پختہ سانچے کو توڑ دیتے ہیں اور کارخانۂ ہستی کی دبی ہوئی پائیدار حقیقتوں کو نکال کر دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔

یہ کام بجائے خود اتنا بڑا ہوتا ہے کہ انسان کو ان مشغولیتوں سے اتنی فرصت مشکل سے مل سکتی ہے کہ خود میدان میں آ کر تعمیر کا عملی کام بھی کر سکے، اگر چہ شاہ صاحب نے ایک جگہ تفہیمات الٰہیہ میں اشارہ کیا ہے کہ اگر موقع ومحل کا اقتضاء ہوتا تو میں جنگ کر کے عملی اصلاح کرتا، مگر واقعہ یہی ہے کہ انھوں نے اس طرز کا کوئی کام نہیں کیا بلکہ خیالات وافکار پر مشتمل تصنیفات کے مسلسل بھاری کام نے شاہ صاحب کی ساری قوتوں کو اپنے اندر جذب کر رکھا تھا اور ان کو اس عظیم شغل سے اتنی مہلت بھی نہ ملتی تھی کہ اپنے قریب ترین ماحول کی طرف توجہ کر سکتے۔

شاہ ولی اللہؒ کی تصنیفات اور افاضات میں ان کے سیاسی خطوط کا ایک اہم مقام ہے جو انھوں نے اپنے دور کے افغان امراء کے نام لکھے تھے۔ ان خطوط میں شاہ صاحب نے افغان امراء کو ہندوستان کی ناگفتہ بہ حالات سے آگاہ کیا ہے اور ان کو اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری ادا کرنے نیز ہندوستان آنے کی دعوت دی ہے۔

حالاتِ زندگی

احمد نام، اور ولی اللہ عرفیت ہے آپ کے والد ماجد شیخ عبدالرحیم ابوالفیض ہیں جو اپنے وقت کے جید علماء میں تھے۔ فتاویٰ عالم گیری کی نظر ثانی میں آپ شریک تھے۔

شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب والد ماجد کی جانب سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک اور

والدہ کی جانب سے امام موسیٰ کاظم تک پہنچتا ہے۔ آپ ۴ رشوال ۱۱۱۴ھ بروز چہار شنبہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت سے قبل آپ کے والد کو آپ کی پیدائش سے متعلق بشارت بھی ہوئی تھی۔[1]

بچپن میں آپ شروع سے سادہ مزاج اور متین واقع ہوئے تھے۔ طبیعت میں نہایت ذہانت تھی، ۵ برس کی عمر میں مکتب میں قرآن مجید پڑھنے کے لیے بھیجے گئے، ساتویں سال قرآن مجید ختم کرلیا اس کے بعد آپ کے والد بزرگوار نے آپ کو نماز اور روزہ کی تاکید کی اور فارسی کی درسی کتب پڑھانی شروع کی۔ ایک سال میں فارسی کی تعلیم مکمل کرانے کے بعد عربی کی ابتدائی کتب صرف ونحو آپ کو پڑھائی گئیں، دس برس کی عمر میں آپ کے والد ماجد نے علم نحو کی معرکۃ الآرا کتاب 'شرح ملا جامی' آپ کو پڑھادی تھی اور عربی کتب کے مطالعہ کی استعداد آپ کے اندر پیدا کردی تھی۔ اس کے بعد معقولات اور فقہ وحدیث کی کتابوں کی طرف آپ کی توجہ ہوئی اور عمر کے پندرہویں سال تمام علوم متداولہ درسی علوم کی تکمیل کرلی اور اس طرح چھوٹی سی عمر میں ارباب علم وفضل کے طبقہ میں آپ کا شمار ہونے لگا۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی تعلیم اکثر اپنے والد بزرگوار کے پاس ہوئی، ایک جگہ آپ نے خود فرمایا ہے:

> ''علم حدیث میں مشکوٰۃ شریف تمام وکمال پڑھی لیکن چند روزہ علالت کی وجہ سے آخر حصہ نہ پڑھ سکا۔ صحیح بخاری شروع سے کتاب الطہارۃ تک پڑھی، شمائل ترمذی اول سے آخر تک، تفسیر بیضاوی اور تفسیر مدارک التنزیل کے کچھ حصے باقاعدہ پڑھے اور باقی حصوں کا خود مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ کامل غور وفکر اور مختلف تفاسیر کے مطالعہ کے ساتھ والد ماجد کے درس قرآن میں حاضری کی توفیق ملی اور اس طرح کئی بار میں نے متن قرآن پڑھا اور میرے حق میں 'فتح عظیم' کا باعث ہوا۔''

شاہ صاحب کی عمر جب ۱۴ سال کی ہوئی تو شادی کی صورت پیدا ہوگئی، آپ کے والد بزرگوار نے اس معاملے میں انتہائی عجلت سے کام لیا سسرال والوں نے سامان شادی تیار نہ ہونے کا عذر کیا لیکن شیخ کے اصرار پر سسرال کے لوگ راضی ہوگئے اور اسی سال شادی ہوگئی۔ یہ حکمت ومصلحت بعد میں ظاہر

۱۔ تذکرہ شاہ ولی اللہ از مولانا مناظر احسن گیلانی۔

ہوئی، چندروز بعد شاہ ولی اللہ صاحب کی خوش دامن اوران کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔

شادی کے ایک سال بعد پندرہ سال کی عمر میں آپ نے اپنے والد بزرگوار کے ہاتھ پر بیعت کی، انھوں نے آپ کو علوم باطنی کی طرف توجہ دلائی۔ آپ ان کی زیرنگرانی اشغال صوفیہ میں مصروف رہے، اسی دوران شاہ ولی اللہ صاحب نے بیضاوی شریف کو پڑھ کر نصابِ تعلیم کو مکمل کرلیا۔ اس خوشی میں شیخ عبدالرحیم صاحب نے بڑے پیمانے پر خواص وعوام کی شاندار دعوت کی اور اپنے ہونہار فرزند کی دستار بندی کی رسم ادا کی۔

اس دوتین سال کے عرصے میں شاہ ولی اللہ صاحب نے اشغال کافیہ سے فراغت کرلی اور آپ کے والد ماجد نے آپ کو بیعت وارشاد کی اجازت وخلافت عطا کی۔

۱۱۳۱ھ میں شاہ صاحب کے والد بزرگوار کا انتقال ہوگیا اور آپ مسندِ درس وارشاد پر جلوہ افروز ہوئے اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

آپ کے علم وفضل اور کمالات ظاہری وباطنی کا شہرہ دوردور تک پہنچ گیا۔ ہرطرف سے تشنگانِ علوم ومعارف جوق درجوق آتے اور زانوئے ادب بچھاتے، تقریباً ۱۲ سال تک آپ نے کتب دینیہ اور مروجہ علوم پڑھائے۔ اس دوران آپ کو ہرعلم وفن میں غور کرنے کا موقعہ ملا۔ اسی زمانہ میں آپ نے مذاہب اربعہ کی فقہ اوران کے اصول کی کتابوں کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا اوران احادیث شریفہ کو بدقت نظر دیکھا جن سے یہ حضرات ائمہ اپنے اقوال ومذاہب کی سند لاتے ہیں اور اسی وقت سے فقہائے محدثین کا طریقہ آپ کے دل نشیں ہوا۔

آپ کا یہ زمانہ نہایت استغراق اور محویت کا گزرا ہے۔ آپ نے نہایت تحقیق وکاوش سے کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور رات دن انتہائی انہماک واستغراق کے ساتھ کتب بینی میں مشغول رہے۔

یہ شوق علم وتحقیق اس قدر بڑھا کہ آپ کو حرمین شریفین جانے کا خیال پیدا ہوا اس لیے کہ جس قدر علم حدیث کی ضرورت آپ محسوس کرتے تھے وہ دہلی میں حاصل نہیں ہوسکتا تھا اس تحصیل وتکمیل کے لیے آپ کو حجاز کا سفر اختیار کرنا ضروری تھا تاکہ وہاں کامل اساتذہ کی صحبت اور اعلیٰ علمی کتابوں کے مطالعے سے اپنی بصیرت اور روحانیت میں اضافہ کریں۔

چنانچہ اسی ارادہ کے تحت ۱۱۳۴ھ کے آخر میں آپ حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں ذرائع نقل وحمل کی کمی اور راستوں کے غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے سفر بڑا مشکل ہوتا تھا لیکن آپ نے زیارت حرمین کے شوق وولولہ اور علم وتحقیق کی لگن سے مجبور ہوکر ان مصائب وتکالیف کو اختیار کیا اور نہایت عزم کے ساتھ حجاز روانہ ہوگئے۔

سب سے پہلے آپ مکہ معظّمہ پہنچے اور اسی سال حج سے فارغ ہوکر مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ کم وبیش ایک سال تک عالم اسلامی کے مختلف علماء ومشائخ سے دلچسپ صحبتیں رہیں اور علوم ظاہر وباطن کا اکتساب کیا۔

قیام حرمین کے زمانے میں شاہ صاحب نے متعدد علماء ومشائخ سے کسب فیض کیا۔ پہلی مرتبہ شاہ صاحب نے ہندوستان میں شیخ محمد افضل المعروف حاجی سیالکوٹی سے حدیث شریف پڑھی تھی، پھر مدینہ طیبہ میں شیخ ابوالطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی سے حدیث شریف پڑھ کر سند واجازت حاصل کی۔ شیخ ابوطاہر شاہ صاحب سے بے انتہا عقیدت ومحبت رکھتے تھے۔ آپ فرماتے ہیں:

''ولی اللہ الفاظ کی سند مجھ سے لیتے ہیں اور میں معنی کی سند اُن سے لیتا ہوں۔''

شیخ ابوطاہر کے علاوہ شاہ صاحب نے شیخ وفداللہ بن شیخ سلیمان مغربی کی درس گاہ میں شرکت کی اور موطّا امام مالک اول سے آخر تک سنائی اور اس کے بعد شیخ محمد بن محمد سلیمان مغربی کی تمام مرویات کی سند لی۔ شاہ صاحب مفتی مکہ شیخ تاج الدین حنفی کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور صحیح بخاری کے علاوہ صحاح ستّہ کے بعض مشکل مقامات کی بھی سماعت کی، ان کے علاوہ موطّا امام مالک اور موطّا امام محمد، کتاب الآثار از امام محمد اور مسند دارمی کی بھی سماعت کی۔ شیخ تاج الدین نے خصوصیت کے ساتھ شاہ صاحب کو تحریری اجازت وسند حدیث عطا کی۔

ان کے علاوہ شاہ صاحب نے اپنے اس مبارک سفر میں دیگر بڑے مشائخ ومحدثین سے بھی استفادہ کیا۔ مثلاً شیخ سناوی، شیخ احمد قشاشی، شیخ عبداللہ بن سالم بصری، شیخ ابوطاہر فقط علم ظاہر کے حامل نہ تھے بلکہ علوم اسرار وباطنہ میں بھی ان کا پایہ بلند تھا۔ شیخ موصوف نے تمام طرق صوفیہ کا خرقہ خلافت بھی اس مبارک سفر میں شاہ صاحب کو عطا کیا ہے۔ القصہ حرمین شریفین میں کامل ایک سال کے قیام کے

دوران شاہ ولی اللہ صاحب نے علمی صحبتوں عمیق مطالعۂ کتب اور امداد غیبی سے حدیث وفقہ میں مجتہدانہ کمال حاصل کیا اور ۱۱۴۴ھ کے آخر میں دوبارہ حج کیا اور ۱۱۴۵ھ کے شروع میں وطن کی طرف واپس ہوئے اور ٹھیک چھے مہینے کے بعد ۱۴ر رجب جمعہ کے دن دہلی پہنچے، شہر کے باشندوں اور علماء وفضلاء نے آپ کا خیر مقدم کیا۔

دہلی آنے کے بعد شاہ صاحب نے گردوپیش کے حالات کا جائزہ لیا اور اپنے عزائم ومقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سب سے پہلے یہ قدم اٹھایا کہ پرانی دلّی میں ایک مقام پر اپنے والد کے ایک چھوٹے سے پرانے مکان میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور وہ مدرسہ رحیمیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ جب آپ کے علمی کمالات کا شہرہ بڑھا تو چند دنوں میں اطراف واکناف سے طلبہ کھینچ کھینچ کر آنے لگے اور وہ جگہ تنگ ہوگئی۔ بادشاہ وقت محمد شاہ (رنگیلے) نے یہ کیفیت دیکھ کر شاہ صاحب کو بلایا اور شہر میں ایک عالیشان حویلی دے دی، یہاں آپ نے دارالحدیث کا افتتاح فرمایا اور پرانی جگہ غیر آباد ہوگئی۔ یہ نیا مدرسہ بڑا عالیشان اور خوبصورت تھا اور اب یہ دارالعلوم بن گیا تھا۔ آپ بڑے جوش وشوق سے درس وتدریس کے مشاغل رکھتے۔ دور دور سے طلبہ یہاں آکر قرآن وحدیث کے درس میں شریک ہوتے اور کسبِ فیض کرتے، یہ دارالعلوم عرصہ دراز تک قائم رہا۔ شاہ صاحب کے بعد آپ کے چاروں صاحبزادوں نے یہی مشغلۂ درس حدیث یہاں جاری رکھا اور ان کے بعد دیگر اہلِ علم حضرات نے یہ خدمت انجام دی، بالآخر ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں مدرسہ تباہ ہوگیا۔

حرمین شریفین سے واپسی کے بعد اس درس وتدریس کے زمانے میں شاہ صاحب نے اپنے اوقات عزیز کو تین اہم مشاغل میں صرف کرنے کے لیے مخصوص کرلیا تھا۔ (۱) صبح کی عبادات واوراد وظائف سے فارغ ہوکر دوپہر تک حدیث کا درس دیتے۔ (۲) علم حدیث کے اسرار ورموز اور علوم نبوت کے حقائق ومعارف کے علاوہ دین کے دقائق وحقائق اور معرفت وتصوف کے اسرار وغوامض پر بھی تقریر فرماتے اور سامعین کو مستفیض فرماتے۔ (۳) تیسرا نہایت اہم مشغلہ آپ کا یہ تھا کہ جو وقت ان دونوں مشاغل سے بچتا اس کا کوئی لمحہ ضائع نہ ہونے دیتے، بلکہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے۔ اس کے بعد آپ نے ہر فن کے لیے ایک شخص تیار کرلیا تھا جس فن کا جو طالب ہوتا اس کو اسی فن کے استاد کے سپرد فرمادیتے، یہ معلم حضرات آپ ہی کے پروردہ اور تربیت یافتہ تھے۔

آپ کی مصروفیت اور استغراق کا یہ عالم تھا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب بیان کرتے ہیں:

''آپ وقت اشراق کے بعد بیٹھتے تو دوپہر تک زانو نہ بدلتے تھے اور نہ دہن مبارک سے تھوک پھینکتے تھے۔''

شاہ صاحب کے زمانے میں تعلیمی حالت بہت فرسودہ اور خراب تھی، آپ نے قدیم طریقہ تعلیم کو بالکل بدل دیا اور اپنے والد بزرگوار کے طریق ونصاب تعلیم کو جاری فرمایا، اس کا مختصر حال یہ ہے کہ پہلے صرف ونحو کے تین چار رسائل وکتابیں حسبِ استعداد طالب علم کو حفظ کرادیتے، اس کے بعد حکمت یا تاریخ کی کوئی عربی کتاب پڑھادی جاتی۔ اس طرح اس کے علم لغت میں اضافہ ہوجاتا، عربی زبان پر قدرت حاصل ہوجانے کے بعد موطا امام مالک کا درس دیا جاتا، قرآن مجید کا ترجمہ بغیر تفسیر پڑھایا جاتا، اس کے بعد تفسیر جلالین پڑھائی جاتی، اس سے فراغت کے بعد کتب حدیث صحیح بخاری صحیح مسلم اور کتب فقہ عقائد وسلوک اور دوسری کتب منطق وفلسفہ پڑھائی جاتی۔ اس نصاب تعلیم سے طلبا کا ذہنی جمود اور غور وفکر کا تعطل ختم ہوگیا۔ اب وہ اندھے مقلد ہونے کے بجائے محقق اور فقہ محدث بن گئے۔ شاہ صاحب کے زمانے میں قرآن مجید کی طرف کوئی توجہ نہ دیتا تھا لوگ اس کو ریشمی جزدانوں میں محفوظ رکھتے تھے تاکہ بوقت ضرورت فال لینے یا حلف لینے کے کام آئے۔ علمی زندگی میں اس سے کوئی استفادہ نہ کیا جاتا تھا۔ حرمین شریفین سے واپسی کے بعد آپ نے یہ صورت حال دیکھ کر قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کرنا شروع کیا، سلسلۂ درس وارشاد کے.... ساتھ ساتھ اس ترجمۂ قرآن مجید کا آغاز ۱۱۵۰ھ میں ہوا اور ۱۱۵۱ھ میں اس کی تکمیل ہوئی پھر ۱۱۵۶ھ میں اس ترجمہ کی تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔

شاہ ولی اللہ صاحب پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے ساڑھے گیارہ سو برس کے بعد سرزمین ہندوستان میں قرآن مجید کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا اور اس کے بعد ترجمۂ قرآن کی بنیاد پڑی۔ آپ کی پیروی میں آپ کے صاحبزادے حضرت شاہ رفیع الدین نے قرآن مجید کا لفظی ترجمہ اردو میں کیا اور دوسرے فرزند حضرت شاہ عبدالقادر نے بامحاورہ اردو ترجمہ موضح القرآن کے نام سے کیا۔ الغرض قرآن مجید کے ترجمہ کا باب سب سے پہلے آپ نے کھولا اور اگر غور کیا جائے تو امت مسلمہ پر آپ کا یہ احسان عظیم ہے ورنہ ہم لوگ قرآن کریم کے ترجمے سے اب تک محروم رہتے لیکن اس زمانے کے علماء سوء

بجائے آپ کے ممنون احسان ہونے اور ہمت افزائی کرنے کے آپ کے مخالف بن گئے اور عوام میں آپ کے خلاف شورش برپا کردی حتیٰ کہ ایک دن نماز عصر کے وقت مسجد فتح پوری سے نکلتے ہوئے ان معاندین اسلام نے چند شر پسندوں کو ہمراہ لے کر آپ کو گھیر لیا اور آپ پر حملہ کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت کی۔ بعد میں یہ مخالفت آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوتی گئی اور آج یہ کیفیت ہے کہ ہم اسی کارنمایاں پر آپ کو ہدیۂ تحسین پیش کررہے ہیں اور ہمارا یہ خیال ہے کہ اگر آپ نے صرف یہی خدمت انجام دی ہوتی تو یہ آپ کا نام زندہ رکھنے کے لیے بہت کافی تھی۔

شاہ صاحب کے زمانے میں ذہنی انحطاط وجمود اس قدر غالب آ گیا تھا کہ حدیث وقرآن کا ذوق بالکل فنا ہوگیا تھا۔ ان کی جگہ فقہائے متاخرین کے فتاوے وجزئیات نے لے لی تھی۔ ہر طرف ان کا شور وغلغلہ تھا۔ کتاب وسنت کی طرف کسی کی نظر نہ تھی۔ مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ترغیبات ونصائح کا اثر زائل ہوچلا تھا اور وہی آزمائشی دور دوبارہ لوٹ آیا تھا جس سے ان دونوں سابق الذکر بزرگوار کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ شاہ صاحب نے یہ صورت حال دیکھ کر علم کے اصل سرچشمہ قرآن وحدیث کی طرف توجہ دلائی اور اجتہاد کی روح کو زندہ کیا۔ آپ کی انتھک کوشش اور مخلصانہ جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج کل ہم اس ملک ہندوستان میں قرآن وحدیث کا چرچا دیکھتے ہیں۔ اسی بارے میں علامہ رشید رضا مصری مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ میں فرماتے ہیں:

> ''اگر ہمارے بھائی ہندوستان کے علماء کی توجہ اس زمانے میں علوم حدیث کی طرف مبذول نہ ہوتی تو اس علم کے زوال اور فنا کا فیصلہ ہوچکا ہوتا۔''

شاہ صاحب کے کارنامے مستقل افادی حیثیت کے مالک ہیں آپ کی تصانیف سے علماء کا ایک بڑا طبقہ آج تک استفادہ کرتا چلا آرہا ہے اور ملک کی دینی وعلمی حالت کا سدھار بہت حد تک آپ کا مرہون منت ہے۔ اگر آپ نے اس وقت علم کی شمع روشن نہ کی ہوتی تو نہ معلوم اس وقت کس قدر جہالت وتاریکی ہوتی، آپ کی نکالی ہوئی نہریں اور علم کے روشن چراغوں سے ہم لوگ فیض پارہے ہیں، آپ نے اپنے عہد کے ذہین اور مفکر لوگوں کو اکٹھا کیا اور ان کو اپنی تعلیمات اور ارشادات سے بہرہ اندوز کرکے اس قابل بنادیا کہ وہ آئندہ کسی زمانے میں ان کے مشن کے مطابق ایک انقلاب برپا کرسکیں، ان ذی عقل اور صاحب فہم تلامذہ نے آپ سے پورا استفادہ کیا اور کچھ عرصے بعد آپ کی نسل مبارک سے شاہ

اسماعیل شہید اٹھے اور دین کی گمراہیوں کو مٹانے کی خاطر علم جہاد بلند کیا۔

آپ کی منزلت علمی کے بارے میں کچھ لکھنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ آپ اسلام کے ان جلیل القدر علماء میں سے ہیں جن کی شہرت وعظمت زمان ومکان کے حدود سے آگے بڑھ چکی ہے۔ آپ کا شمار عبقریین ونوابغہ میں ہوتا ہے۔ آپ جیسی عالی پایہ شخصیتیں اور یگانۂ روزگار ہستیاں بہت کم وجود میں آتی ہیں، آپ کا دور زوال وانحطاط کا دور کہا جاتا ہے اور اس دور ظلمت میں ایسی وسیع النظر دقیقہ رس اور ژرف نگاہ ہستی کا وجود میں آنا ایک قابلِ حیرت امر ہے۔ آپ نے اپنے ماحول سے کوئی اثر قبول نہیں کیا، آپ کی ذہنی سطح اور آپ کے علوم ومعارف اپنے ہم عصر علماء کی سطح سے بہت بلند ہیں، نواب صدیق حسن خاں مرحوم اپنی کتاب 'اتحاف النبلا' میں فرماتے ہیں:

"اگر وجود اور در صدر اول درزمانۂ ماضی می بود امام الائمه وتاج المجتهدین شمرده می شود"

یعنی اگر آپ کا وجود گزشتہ زمانے میں صدر اول میں ہوتا تو آپ تمام مجتہدوں کے پیشوا اور مقتدا مانے جاتے بلکہ ان کے سرتاج بنائے جاتے اور امام الائمہ کا گراں قدر خطاب پاتے۔

شاہ صاحب کے علمی وذہنی کمالات واقعی اسی تعریف وتوصیف کے لائق ہیں اور آج بھی امت مسلمہ آپ کو حکیم الامت اور مجدد وملت کے القاب سے یاد کرتی ہے آپ کے خارق عادت علمی کارناموں اور غیر معمولی ذہانت ودینی خدمات جلیلہ دیکھ کر آپ کے ہم عصر علماء وفضلاء نے بڑی قدر ومنزلت سے آپ کا ذکر کیا ہے۔ حضرت مرزا محمد مظہر جان جاناں فرماتے ہیں:

"حضرت شاه ولی الله محدث رحمة الله علیه طریقه جدیده بیان نموده اند، در تحقیق اسرارِ معارف وغوامض علوم طرزِ خاص دارند بایں همه علوم وکمالات از علماء ربانی اند مثل ایشاء در محققان طریقه صوفیه کی جامع اند در علم ظاهر وباطن وعلم کو بیان کرده اند چند کس گزشته باشند۔"

آپ کے معاصر مولانا فخر الدین فخر جہاں نے اپنے رسالہ ''فخر الحسن'' میں آپ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"شیخ صاحب المقامات العالیه والکرامات الجلیلة الشیخ ولی الله المحدث سلسله الله تعالیٰ و ابقاه۔"

امیر شاہ خاں نے امیر الروایات میں مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دار العلوم دیوبند کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے ہندوستان کے علاوہ دیگر اقطاع عرب وعجم میں شاہ صاحب کی مقبولیت ومنزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔اس بارے میں امیر شاہ خاں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

''مولانا نانوتوی کا جہاز دورانِ سفر حج یمن کی کسی بندرگاہ پر رک گیا، مولانا کو کسی کے ذریعہ معلوم ہوا کہ اس شہر میں کوئی معمر بزرگ ہیں، جب ملاقات ہوئی تو مولانا ان کے علم سے بہت متاثر ہوئے اور مسند حدیث کی اجازت چاہی، محدث بزرگ نے پوچھا کہ تم کس کے شاگرد ہو؟ مولانا نے اپنا سلسلۂ تلمذ شاہ عبدالعزیز شاگرد وفرزند شاہ ولی اللہ تک بیان کیا تو بزرگ محدث نے کہا کہ میں ان کو جانتا ہوں، میرے نزدیک شاہ ولی اللہ گویا شجر طوبیٰ ہیں، جس طرح جہاں جہاں طوبیٰ کی شاخیں ہیں وہاں جنت ہے اور جہاں اس کی شاخیں نہیں ہیں وہاں جنت نہیں ہے، اس طرح جہاں شاہ ولی اللہ کا سلسلۂ تلمذ ہے وہاں جنت ہے اور جہاں ان کا سلسلۂ تلمذ نہیں ہے وہاں جنت نہیں ہے۔''

ان کے علاوہ مولانا محمد عاشق پھلتی نے مقدمہ خیر کثیر میں صاحب 'سیر الاخیار' نے شاہ صاحب کے یکتائے روزگار اور مجتہد عصر، منبع علوم واسرار دین اور مخزن کمالات وراثت محمدیہ ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

مولانا فضل حق خیر آبادی کے شاگرد مولانا محسن بخاری اپنی کتاب 'الیانع الجنّی' میں خود اپنی شہادت بیان کرتے ہیں:

''ان کے شیخ مولانا فضل حق قبلہ کے ہاتھ شاہ صاحب کی کتاب کے

'ازالة الخفاء' کا ایک نسخہ کہیں سے ہاتھ لگا، مولانا اس کے مطالعہ کے بڑے خواہش مند تھے اور جب بھی موقع ملتا تو بکثرت اس کتاب کے مطالعہ میں مصروف رہتے، مولانا نے اس کتاب کو پڑھ کر سب کے سامنے فرمایا کہ جس شخص نے یہ کتاب تصنیف کی ہے وہ ایک بحرِ بیکراں ہے جس کے ساحل کا پتہ نہیں چلتا ہے۔''

شاہ ولی اللہ صاحب کا مسلک علماء کے درمیان عرصہ سے متنازعہ موضوع رہا ہے، بعض لوگ آپ کو حنفی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بعض لوگ اہلِ حدیث، بعض حضرات مقلد بتاتے ہیں، بعض غیر مقلد بیان کرتے ہیں ہر گروہ آپ کو اپنے زمرہ اور فرقہ میں شمار کرنے کی سعی کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود آپ کو اس تفریق اور عصبیت سے سخت نفرت تھی لیکن تعجب ہے کہ لوگوں نے آپ کی شخصیت ہی کو بحث کا موضوع بنالیا۔ آپ کا طریقہ دراصل مجتہدانہ تھا، کسی مسئلہ کو آپ تقلیدی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے بلکہ کتاب وسنت کی روشنی میں غور کرتے اور پھر حنفی فقہ اور دیگر مذاہب فقہ میں تحقیق کرتے، جب ہر طرح اسے ٹھیک و درست پاتے تو قبول کر لیتے ورنہ متروک قرار دیتے تھے، گویا ہر معاملے پر آپ ایک محقق کی حیثیت سے نظر ڈالتے تھے، کسی خاص مذہب کی جانب داری اور دیگر مذاہب سے عناد رکھنا آپ کی روش کے خلاف تھا، کسی مسئلے کی تائید فرماتے تو دلائل کی بناء پر اور مخالفت کرتے تو بھی بر بنائے دلیل، اس تائید ومخالفت میں کوئی عصبیت اور جانب داری کارفرمان نہ ہوتی، بہت سے مسائل میں آپ نے مسلک حنفی کی پیروی کی ہے اور بہت سے امور میں آپ نے دوسرے مذاہب کو ترجیح دی ہے اور دوسرے ائمہ کا مسلک اختیار کیا ہے، بہتیرے مقامات پر آپ نے مذہب حنفی ومسلک اہلِ حدیث کو جمع کیا ہے اور جس مسلک کو اقرب الی السنۃ اور صحیح تر پایا اسے اختیار کیا ہے، اپنے مسلک کی توضیح کرتے ہوئے ایک جگہ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

میں مذاہب اربعہ مشہورہ میں بقدر امکان جمع کرتا ہوں اور صوم وصلوۃ وضوء وغسل وحج کے مسائل اس وضع پر واقع ہیں جسے تمام اہلِ مذاہب جانتے ہیں جب جمع وتطبیق غیر ممکن ہوجاتی ہے تو میں اس مذہب پر عمل کرتا ہوں جو دلیل کی بناء پر زیادہ قوی اور حدیث کی بنیاد پر صحیح ہے کیوں کہ خدائے

قدوس نے مجھے اس قدر علم عطا فرمایا ہے کہ میں ضعیف وقوی میں اچھی طرح فرق کرسکتا ہوں، اور فتویٰ دیتے وقت مستفتی کے حال کی رعایت بخوبی کرسکتا ہوں، ہر مقلد مذہب کو اس کے مسلک کے مطابق جواب دیتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے مذاہب مشہورہ کی معرفت عنایت فرمائی ہے۔''

انفاس العارفین میں تحریر فرماتے ہیں:

بیش تر امور میں مذہب حنفی کے مطابق عمل کرتا ہوں لیکن بعض امور کو حدیث اور وجدان کے ذریعہ پرکھ کر دیگر مذاہب کے مطابق سرانجام دیتا ہوں مثلاً قرآۃ سورہ فاتحہ خلف الامام اور قرأۃ فاتحہ در جنازہ''

شاہ صاحب نہایت سادہ طبیعت اور منکسر المزاج تھے، ہر شخص سے نہایت محبت اور خندہ پیشانی سے ملتے تھے، خلوت وجلوت میں کبھی کسی کی برائی بیان نہ کرتے اور دشمن کے حق میں بھی دعائے خیر کرتے، مزاج میں نرمی ونفاست تھی لیکن ریا ونمود اور ظاہری شان وشوکت سے پرہیز فرماتے تھے، نہایت بلند ہمت فراخ حوصلہ اور جفاکش تھے، مشکلات اور مصائب کے مواقع پر نہایت صبر وسکون سے قائم رہتے اور پایۂ استقلال میں جنبش نہ آتی، اظہارِ حق کے سلسلے میں آپ کو مختلف طریقے سے ستایا گیا لیکن آپ کے استقلال اور استقامت میں کوئی کمی نہ آئی۔ آپ کے زمانے میں شہر دہلی فتنے اور خانہ جنگیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ ایک مرتبہ بدامنی بہت بڑھ گئی تو دہلی کے شرفاء نے ہندو رسم کے مطابق 'جوہر' کا ارادہ کرلیا تاکہ اپنی عزت وناموس کی حفاظت کی خاطر سب آگ میں جل مریں اور حالات سے نجات حاصل ہو لیکن شاہ صاحب نے کربلا کے واقعات یاد دلا کر صبر وعزیمت کی تلقین کی جس سے متاثر ہوکر دہلی کے باشندے اس قبیح ارادے سے باز رہے۔

شاہ صاحب کے آخری دور میں دہلی میں ایک متعصب اور غالی امیر نجف علی خاں کا تسلط ہوگیا تھا، یہ مغل دربار کا آخری امیر تھا، اس نے بہت سے علماء کو دردناک سزائیں دیں، امیر الروایات میں تذکرہ ہے کہ نجف علی خاں نے شاہ ولی اللہ صاحب کے پہونچے اتروا کر ہاتھ بیکار کردیے تھے تاکہ وہ کوئی کتاب یا مضمون تحریر نہ کرسکیں۔

آپ کی عمر اکسٹھ سال سے زائد ہوچکی تھی، مرض الموت نے کچھ عرصے تک آپ کو علالت

میں مبتلا رکھا اور ۲۹ رمحرم ۱۱۷۶ھ کو آسمان علم واجتہاد کا یہ آفتاب دہلی میں ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا اور اپنے پیچھے بے شمار ستارے روشن کر گیا، آپ کی تاریخ وفات کا مصرعہ: "او بود امام اعظم دیں۔" ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے پیچھے چار یادگار بیٹے چھوڑے، شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع یالدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی، ان میں ہر ایک آسمان علم وفضل کا روشن ستارہ اور درخشاں چاند ہے۔

نواب صدیق حسن خاں قنوجی 'اتحاف النبلا' میں فرماتے ہیں:

"هر یکے از ایشاں بے نظیر وقت و فرید دهر و وحید عصر در علم ومل وعقل وفهم وقوت تقریر فصاحت، تحریر و تقویٰ و دیانت وامانت و مراتب ولایت بود و هم چنیں اولادِ اولاد این سلسله از طلائے نایاب است۔"

شاہ صاحب کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، ملک کے اطراف سے صدہا طالب علم آتے اور آپ سے مستفید ہوتے تھے، حرمین شریفین سے بھی کئی حضرات آپ کے پاس علم وحکومت سیکھنے آتے تھے، آپ کے تلامذہ کی فہرست ملنا مشکل ہے لیکن چند ممتاز شاگردوں میں آپ کے چاروں صاحبزادوں کے علاوہ شاہ محمد عاشق پھلتی، شاہ نوراللہ، مولانا جمال الدین، شاہ امین کشمیری اور شاہ ابو سعید کے نام آتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ عصر حاضر کے تمام علمائے ہند آپ کے معنوی شاگرد ہیں تو کسی طرح بے جا نہ ہوگا، ہندوستان کے اکثر مدارس میں حدیث شریف کی سند واجازت کی روایت آپ سے کی جاتی ہے۔

ایک مصنف کی حیثیت سے شاہ صاحب کا درجہ نہایت بلند ہے، آپ نے مروّجہ قدیم طرزِ تحریر اور اسلوب نگارش کو وسعت بخشی اور لفظی قافیہ بندی اور بیجا ثقافت کی حد بندی سے آزاد کر دیا اور حکیمانہ خیالات اور علمی مضامین کو بطریقِ احسن سادہ، جامع انداز میں پیش کرنے کی خدمت انجام دی، زمانۂ قدیم میں شاہ صاحب پہلے علامہ ابن خلدون نے عربی نثر کو نامانوس اور پرشکوہ الفاظ کے طلسم سے آزاد کیا تھا، اور مقدمہ لکھ کر سادہ اور سلیس عربی نثر کا نمونہ پیش کیا تھا، ابن خلدون کے بعد شاہ صاحب ایک ایسے مصنف کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جنھوں نے باوجود عجمی اور ہندوستانی ہونے، عربی

فصاحت و بلاغت کا بے نظیر نمونہ پیش کیا اور اپنی کتاب **حجۃ اللّٰہ البالغہ** میں ابن خلدون کے اسلوب نگارش کو پیش کیا۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں:

''شاہ ولی اللہ پہلے ہندوستانی مصنف ہیں جن کی عربی تصانیف خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ میں اہلِ زبان کی سی روانی وقدرت اور اہلِ عرب کی عربیت ہے اور وہ ان بے اعتدالیوں سے پاک درست جو عجمی علمائے کی عربی تحریر میں پائی جاتی ہیں۔''

آپ کے اسلوب نگارش اور جداگانہ طرزِ تصنیف کے بارے میں مولانا مناظر احسن گیلانی اپنی کتاب 'تذکرۂ شاہ ولی اللہ' میں فرماتے ہیں:

''عربی زبان میں شاہ صاحب نے جتنی کتابیں لکھیں ان میں ایک خاص قسم کی انشاء کی 'جوان کا مخصوص اسلوب ہے' پوری پابندی کی ہے، شاہ صاحب پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اپنی عبارتوں میں جوامع الکلم، النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ گفتگو کی پیروی کی ہے۔حتی الوسع وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدّعا ومقصد کا اظہار ان ہی لغات اور ان ہی محاورات سے کریں جو لسان نبوت اور زبان رسالت سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔''

آپ کی تحریر میں ایجاز، وسعت نظر، سلاست بیان، قوت انشاء، رفعتِ خیال و دقّت نظر پوری طرح موجود ہے، اسی طرح آپ کی تقریر نہایت مؤثر ہوتی تھی، دینی مجالس اور علمی محفلوں میں آپ کی خوش بیانی اور لذتِ تقریر سامعین پر محویت کا عالم طاری کر دیتی تھی، آپ کی فصاحت و بلاغت اور قادر الکلامی کا اعتراف آپ کے عہد کے تمام علماء کو تھا۔

شاہ ولی اللہ ان چند ممتاز مصنفین میں سے ہیں جن کی تعداد مصنفین اسلام کی بے نظیر کثرت کے باوجود بہت کم ہے، دنیا کے کسی مذہب کی علمی تاریخ اتنا وسیع و معمور اور قیمتی کتب خانہ نہیں پیش کر سکتی ہے جتنا اسلام نے پیش کیا ہے، لیکن اس موقع پر ہمارے سامنے عظمت کا معیار

تصانیف کی کثرت، موضوع کا تنوع، کتابوں کی ضخامت، تصانیف کی مقبولیت، مضامین کا اشکال اور پیچیدگی، خیالات میں تعمّق اورفہم یا تشریح مطالب میں موشگافی، متن کا اختصار اور مطالب کی تلخیص میں سے کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ سب کمالات اپنی جگہ مسلّم ہیں اور یہ تمام علمی خدمات اپنے اپنے زمانے میں لائق احترام ہیں لیکن تجدید وامامت کا مقام اس سے بلند ہے، ہر مصنف امام وقت اور مجدد فن نہیں ہوتا ہے۔ اس مقام کے لیے شرط ہے کہ مصنف نے کسی ایسے موضوع پر لکھا ہو جس سے اس وقت تک کا علمی کتب خانہ خالی ہو، نئے علمی نظریات تازہ خیالات اور جدید تحقیقات پیش کی ہوں، اس کے یہاں جودت فکر ہو، ذہن کا اجتہاد ہو اور مضامین ومطالب میں اصلیت اور اولیت ہو، اگر تنہا یہی شرط ہے تو علامہ ابن خلدون ایسے مصنف کی بہترین مثال ہے لیکن اگر 'فکرِ ارجمند' کے ساتھ 'دل دردمند' اور عقل کے ساتھ عشق کا اجتماع ہو جائے اور مصنف کا قلم نغمہ زن کی انگلی کی طرح ربابِ دل کے تاروں کے ساتھ کھیلنے لگے تو وہ صرف مصنف نہیں رہتا ہے بلکہ ایک اخلاقی اور دینی مصلح بھی بن جاتا ہے، امام غزالی کی احیاء العلوم اور تہافت الفلاسفہ میں یہ رنگ پایا جاتا ہے لیکن اگر علم واستدلال کے ساتھ کسی صحیح دینی تحریک ودعوت میں کسی اصلاحی جوش اور کسی صالح انقلاب کی خواہش شامل ہو جائے اور اس کی تحریروں اور تصنیفات میں سے کئی نئے دور کا آغاز اور کسی نئی تحریک کے ظہور کا سامان ہو تو وہ مجدد کہلانے کا مستحق ہوتا ہے، امام ابن تیمیہ اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی روشن مثال ہیں۔ ہمارے نزدیک شاہ ولی اللہ.... ان حضرات میں سے اکثر کمالات کے جامع ہیں، اسلام کے باکمال مصنفین کی جتنی مختصر فہرست بنائی جائے شاہ صاحب کے نام کے بغیر وہ فہرست نامکمل رہے گی اور ترتیب ومراتب کے لحاظ سے آپ کا نام اتنا پیچھے نہیں رہے گا جتنا تاریخ کے لحاظ سے آپ کا زمانہ پیچھے ہے۔ شاہ صاحب نے خود ایک شعر فرمایا ہے:

وانــی وان کنــت الا خیــر زمـانة
لآن بـمــا لـم تستـطعـه الاوائل

خصوصیاتِ تصانیف

اسلامی مسائل میں عقل ونقل کی تطبیق اور ان کی حکیمانہ توجیہ وتشریح، بارہویں صدی کے عالم

کے لیے بالکل نیا موضوع نہیں تھا، خود شاہ صاحب نے **حجۃ اللّٰہ البالغہ** کے مقدمے میں امام غزالی، خطابی اور شیخ الاسلام عز الدین بن عبدالسلام کا نام لیا ہے جنھوں نے احکام شرعی کے حکم ومصالح بیان کیے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان بزرگوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی حیثیت اشارات ونکات سے زیادہ نہیں ہے، اسلام کے پورے نظام شرعی کی حکیمانہ تشریح ہمیں شاہ صاحب سے پہلے نہیں ملتی ہے، اس اہتمام، وسعت اور جامعیت کے ساتھ اس موضوع پر ہمارے علم میں **حجۃ اللّٰہ البالغہ** پہلی تصنیف ہے اور پھر اس کے اکثر ابواب ومضامین بالکل نئے ہیں اور فلسفۂ علم کلام قرآن وحدیث تصوف اور ذاتی غور ومشاہدہ اور قوت استدلال کی آمیزش شاہ صاحب ہی کا حق ہے۔

اصول تفسیر پر کوئی چیز عام طور پر نہیں ملتی ہے، صرف چند اصول اور قواعد کے مقدمے میں یا اپنا طرز تصنیف بیان کرنے کے لیے بعض مصنفین چند سطروں میں لکھ دیتے ہیں، شاہ صاحب کی کتاب **الفوز الکبیر فی اصول التفسیر** بھی اگرچہ مختصر ہے لیکن پوری کتاب سراسر نکات وکلیات پر مشتمل ہے اور درحقیقت ایک جلیل القدر عالم کی ایک قیمتی اور نادر بیاض ہے جس کو فہم قرآن کی مشکلات کا عملی تجربہ ہے اور اپنے وجدان اور اصابت رائے پر اعتماد بھی ہے۔ اس موقع پر مناسب ہوگا اگر ہم شاہ صاحب کے ایک خصوصی امتیاز کی طرف بھی اشارہ کردیں جس میں شاہ صاحب نہ صرف اپنے زمانے میں بلکہ ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ میں منفرد ہیں، وہ خصوصیت شاہ صاحب کی عربیت اور عربی زبان میں ان کی قدرت تحریر ہے۔

ہمارے ملک میں عربی کا صحیح اور اعلیٰ ذوق بہت نایاب رہا ہے۔ اگر جستجو کی جائے تو میر غلام علی آزاد بلگرامی صاحب **سبحۃ المرجان** سید مرتضیٰ زبیدی صاحب ''تاج العروس''، شیخ احمد حسن شروانی صاحب **نفحۃ الیمن** جیسے چند مصنفین کو چھوڑ کر جن کی زندگی کا بڑا حصہ عرب فضلاء کی صحبت اور عرب ممالک میں گزرا ہے، ایسے مصنفین کا ملنا مشکل ہے جن کی عربی تحریر ادبی سقم سے پاک اور عربی ذوق کے مطابق سلیس اور رواں ہو۔

ہمارے یہاں کے نصاب درس کی مخصوص ساخت اور ہندوستان میں عربی نظم کے نمونوں کی زیادتی اور خوبی کی وجہ سے ہندی علماء کی نظم ان کی عربی نثر سے کہیں بہتر ہے۔

شاہ ولی اللہ.... پہلے ہندوستانی مصنف ہیں جن کی عربی تصانیف بالخصوص **حجۃ اللّٰہ**

البالغہ میں اہلِ زبان کی سی روانی اور قدرت اور ادباءِ عرب کی سی عربیت ہے اور ان تمام بے اعتدالیوں سے پاک ہے جو عجمی علماء کی عربی تحریر میں پائی جاتی ہیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ابن خلدون کے مقدمے کے بعد ہمیں اگر کوئی تصنیف دین وحکمت کے علوم پر مشتمل ملتی ہے تو اس طویل مدت میں صرف اسی ہندوستانی عالم کی شاہکار تصنیف "**حجۃ اللّٰہ البالغہ**" ہے۔ حدیث وفقہ کے مضامین کو سلیس عربی زبان میں ادا کر دینا ایک عالم کے لیے بڑا کمال نہیں ہے لیکن حجۃ اللہ البالغہ کا مبحث ثالث جس میں ارتفاقات یعنی تدابیر نافعہ کے ابواب ہیں، اسی طرح دوسرے مباحث جن کے لیے شاہ صاحب کے سامنے کوئی دوسرا نمونہ نہیں تھا، صاحب تصنیف کی عظمت اور عبقریت کی دلیل ہیں۔

شاہ صاحب کی تصانیف بے شمار ہیں، بعض مورخین دوسو سے زائد بیان کرتے ہیں، مصنف حیات ولی نے ان کی تعداد اکیاون بتائی ہے۔ ہم یہاں صرف ان کتابوں کا ذکر کریں گے جو طبع ہو کر مشرق سے مغرب تک مشہور ہو چکی ہیں۔

۱۔فتح الرحمن فی ترجمۃ القرآن:

یہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے اور تاریخ اسلام میں سب سے پہلا اور بہترین ترجمہ ہے اور آج تک اس کا مقابل کوئی ترجمہ نہیں ہو سکا ہے، اس کی خصوصیات پر شاہ صاحب نے خود مقدمہ فتح الرحمٰن میں روشنی ڈالی ہے، ترجمے کے ساتھ جا بجا فوائد بھی ہیں جو نہایت مختصر ہیں لیکن جامعیت اور مشکلات کی گرہ کشائی میں بے مثل ہیں، یہ ترجمہ ہندوستان میں متعدد بار شائع ہو چکا ہے اور بڑا مقبول ہے۔

۲۔الفوزالکبیر فی اصول التفسیر:

فارسی زبان میں اصول تفسیر پر مختصر اور جامع رسالہ ہے، اس میں شاہ صاحب نے قرآن مجید کے علوم خمسہ، تأویل حروف مقطعات، انبیاء کے واقعات وقصص کے اسرار اور ناسخ ومنسوخ کے اصول پر نہایت مفید اور بصیرت افروز مقالات لکھے ہیں۔ اس رسالہ کے اردو اور عربی زبان میں ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

۳۔ فتح الخبیر بها لابدّ من حفظه فی علم التفسیر:

یہ عربی زبان میں آیات قرآنی کی تمام ماثورہ تفاسیر کا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ

کرام سے منقول ہیں ایک مختصر اور جامع نمونہ ہے۔ اس میں شرح غریب القرآن اور اسباب نزول آیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب **الفوز الکبیر** کے ساتھ طبع ہو چکی ہے۔

۴۔تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء:

انبیاء علیہم السلام کے مکذبین و منکرین پر جو عذاب آئے اور رسولوں کے ذریعہ جن معجزات کا ظہور ہوا، کتاب میں ان کو فطرت کے مطابق ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ مخفی اسباب مادّیہ کے باعث ظہور میں آئے ہیں، ان معجزات کا خارق عادت ہونا محض ہماری کوتاہ نظری کی بنا پر ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

۵۔المسوی مِن احادیث الموطّا:

عربی زبان میں موطا امام مالک کی شرح ہے، اس میں آپ نے احادیث کو اپنے مذاق کے موافق نئی ترتیب سے مدوّن کیا ہے اور شرح میں وہ اسلوب اختیار کیا ہے جو طالب علم کے لیے سہل اور دلنشیں ہو، حدیث سے مستنبط مسائل اور امام مالک پر دیگر ائمہ کے مناسب تعقبات بھی نہایت لطیف اشاروں میں بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب گویا آپ کے اختیار کردہ طریقۂ درس حدیث کا نمونہ ہے ہندوستان میں المصفّی کے ساتھ طبع ہو چکی ہے، مکہ معظّمہ سے بھی شائع ہوئی ہے۔

۶۔المصفّٰی شرح موطّا:

موطّا امام مالک کی فارسی شرح ہے، اس میں آپ نے احادیث اور آثار کو الگ الگ کر دیا ہے اور اقوال امام مالک کو مناسب طریقے سے بیان کیا ہے، دیگر فقہاء کے اقوال بھی نقل کیے ہیں اور احادیث پر مجتہدانہ طریق سے بحث کی ہے۔

۷۔شرح تراجم ابواب بخاری:

اس رسالے میں آپ نے امام بخاری کے قائم کردہ عنواناتِ ابواب کی تشریح اور توجیہ اس طرح بیان کی ہے کہ ان کے ذیل میں دی ہوئی احادیث سے ابواب کی مناسبت صحیح طور پر سمجھ میں آجاتی ہے اور کوئی اغلاق باقی نہیں رہتا ہے، یہ رسالہ عربی زبان میں ہے اور دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہو چکا ہے، پاکستان میں صحیح بخاری کے ساتھ یہ رسالہ شائع ہوا۔

۸۔حجۃ اللّٰہ البالغہ:

یہ کتاب بجا طور پر آپ کا تصنیفی شاہکار کہی جا سکتی ہے، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اس کے متعلق فرماتے ہیں:

> ''شاہ صاحب کی مایۂ ناز تصنیف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان معجزات میں سے ہے جو آنحضرت کی وفات کے بعد آپ کے امتیوں کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے ہیں اور جن سے اپنے وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجاز نمایاں اور اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہوئی ہے۔''

یہ کتاب دراصل اسی تعریف کے لائق ہے، اس میں شاہ صاحب نے تعلیمات اسلام کو فطرت کے مطابق اور احکام دینیہ کو عدل پر مبنی قرار دیا ہے، ہر حکم الٰہی اور امر شریعت کے اسرار و مصالح نہایت بلیغ اور مدلل انداز میں بیان کیے ہیں جس سے ایک طرف تو متشککین اور دین میں تردد رکھنے والے حضرات کے شکوک وشبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے اور دوسری جانب معترضین کے احکام اسلام پر اعتراضات کا منہ توڑ جواب مل جاتا ہے۔ شاہ صاحب کو یقین تھا کہ کچھ عرصہ بعد عقلیت پرستی کا دور آنے والا ہے جس میں احکام شریعت کے متعلق اوہام وشکوک کی گرم بازاری ہوگی، اس خطرہ کو آپ نے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا اور اس کے سدّ باب میں یہ بے نظیر کتاب لکھی۔ اس کتاب میں شاہ صاحب نے مابعد الطبیعی مسائل سے ابتدا کی ہے اور فلسفۂ اسلام کو ایک مرتب شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، قدرت کے قانون مکافات کو حکمت کے انداز پر بیان کیا ہے، اس کے بعد ارتفاقات یعنی تدابیر نافعہ کے زیرِ عنوان اقتصادیات اور سیاسیات کے مسائل پر بحث کی ہے۔ پھر اخلاقیات کا موضوع اٹھایا ہے اور انسانی سعادت پر بحث کی ہے، اس کے بعد نظام شریعت کے عقائد وارکان پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے اسرار و حکم بیان فرمائے ہیں اور معاصی اور ان کے اسباب وعلل پر تفصیلی بحث کی ہے، اس کے بعد تاریخ مذاہب عالم پر تبصرہ کیا ہے اور تشریع اور قانون سازی کے بارے میں نہایت مفید نکات بیان کیے ہیں۔ آخر میں آپ نے حدیث سے استنباط کا صحیح طریقہ بتایا ہے اور فقہ سے متعلق بیش بہا معلومات بہم پہونچائی ہیں۔ دوسری جلد میں آپ نے فقہی طرز پر ابواب قائم کر کے شریعت کے جملہ احکام پر مفصل تبصرہ کیا ہے اور ہر حکم کی علت غائی، اس کی حکمت اور فوائد ومصالح بیان کیے ہیں جس کی بناء پر کتاب کا پڑھنے والا ان احکام دینیہ پر علی وجہ البصیرت ایمان لے آتا ہے اور اس کے تمام شکوک وشبہات زائل

ہوجاتے ہیں،نواب صدیق حسن خاں قنوجی "**اتحاف النبلاء**" میں تحریر فرماتے ہیں:

"ایں کتاب اگرچہ در علم حدیث نیست، امّا شرحِ احادیث بسیار دراں کردہ وحکم واسرار آں بیاں نمودہ تاآنکہ در فن خود غیر مسبوق علیہ واقع شدہ، ومثل آں دریں دوازہ صد سال ھجری، ھیچ یکے از علمائے عرب وعجم تضیفے موجود نیامدہ۔"

یہ کتاب متعدد بار ہندوستان اور مصر سے شائع ہوچکی ہے،اس کے اردو ترجمے بھی چھپ چکے ہیں۔

۹۔البدور البازغة:

اس دقیق کتاب میں فلسفہ وتصوف کے حقائق ومعارف بیان کیے ہیں،بعض ابواب "**حجة البالغه**" کے مضامین کا خلاصہ ہیں، یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور چھپ چکی ہے۔

۱۰۔ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء:

حجة اللّٰه البالغه کے بعد شاہ صاحب کی یہ دوسری معرکۃ الآراء تصنیف ہے،اس میں شاہ صاحب نے خلفائے راشدین کی خلافت قرآن مجید،احادیث،تفسیر اور تاریخ سے ثابت کی ہے اور شیعہ وسنی کے باہمی اختلافات کو نہایت عدل وانصاف سے حل کیا ہے جس سے جانبین کی غلط فہمیاں اور عصبیتیں دور ہوجاتی ہیں۔خلافتِ راشدہ کے ثبوت کے ساتھ ساتھ اس میں سیرت وتاریخ اور سیاست وخلافت کے بارے میں دیگر بیش بہا نکات بھی بیان فرمائے ہیں، مثلاً اسلام میں صحابہ کرام کا درجہ ومقام، ان کے حقوق وفضائل، خلافت خاصہ کی تعریف، اس کے اوصاف اور نبی، خلیفہ، محدث اور صدیق کی تعریف، حضرت عمر فاروق کے شاندار کارنامے اور قابل قدر دینی خدمات، تاریخ اسلام کے مختلف ادوار اور ان پر ہر پہلو سے تبصرہ، اسلام کا تمدنی اور عمرانی نظام اور اصول سیاست وغیرہ پر سیر حاصل بحثیں، مولانا عبدالحئ فرنگی محلی فرماتے ہیں:''اس موضوع پر پورے اسلامی لٹریچر میں ایسی کوئی کتاب موجود نہیں ہے، یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور شائع ہوچکی ہے۔

۱۱۔ تفهيمات الٰهيه:

یہ کتاب بقول مولانا منظور نعمانی:''ولی اللّٰہی کشکول'' ہے،اس میں زیادہ تر تصوف وسلوک

سے متعلق مقالات ہیں اور علوم شریعت کے بارے میں بھی مضامین ملتے ہیں، بعض مقامات پر معاشرے کے ہر طبقے کے افراد کو مخاطب کر کے اصلاح پر ابھارا ہے، کہیں پر ماورا الطبیعی فلسفے سے متعلق باتیں کہیں ہیں، کتاب کا کچھ حصہ عربی میں اور کچھ فارسی میں ہے۔ پوری کتاب دو جلدوں میں ہے اور چھپ چکی ہے۔

۱۲۔ عربی زبان میں آپ کے سوز و گداز سے معمور نعتیہ قصائد کا ایک مجموعہ دیوان 'اطیب النغم' ہے اس مجموعے کو شاہ عبدالعزیز صاحب نے مرتب کیا ہے۔

۱۳۔الخیر الکثیر:

تصوف کے اسرار و حقائق پر مشتمل عربی زبان میں تصنیف ہے، چھپ چکی ہے، اردو ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔

۱۴۔ فیوض الحرمین:

قیام حرمین کے دوران، فیوض و برکات کا تذکرہ ہے۔ عربی زبان میں ہے، اردو ترجمہ کے ساتھ چھپ چکی ہے۔

۱۵۔الانصاف فی بیان أسباب الاختلاف:

احکام شریعت کے متعلق صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین کے اختلافات کے اسباب کا تذکرہ ہے، ہر گروہ کی افراط و تفریط پر تنقید کی ہے، عربی زبان میں ہے، مصر سے بھی شائع ہوئی اور یہاں ہندوستان میں اردو ترجمہ کے ساتھ چھپ چکی ہے۔

۱۶۔عقد الجید فی احکام الاجتهاد والتقلید:

عربی زبان میں آپ نے اجتہاد اور تقلید کے مسئلے پر نہایت محققانہ بحث کی ہے، اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

۱۷۔انفاس العارفین:

فارسی زبان میں شاہ صاحب نے اپنے بزرگوں کے حالات درج کیے ہیں۔

۱۸۔ البلاغ المبین یا تحفة الموحدین:

دعوت توحید اور ردّ شرک میں رسالہ ہے۔ فارسی زبان میں یہ رسالہ لکھا گیا تھا، اردو ترجمہ کے

ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

۱۹۔القول الجمیل:

تصوف کے اذکار و وظائف اور چاروں سلاسل کا تذکرہ ہے۔ کتاب عربی میں ہے، اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

۲۰۔قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین:

شیخین کے فضائل کے متعلق فارسی زبان میں بہت عمدہ رسالہ ہے، چھپ چکا ہے۔

۲۱۔سرور المحزون فی ترجمۃ نور العیون:

ابن سید الناس نے سیرت نبویہؐ پر ایک ضخیم کتاب 'عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر' لکھی تھی پھر اس کا خلاصہ 'نور العیون فی سیر الامین المامون' لکھا تھا، شاہ صاحب نے بعض بزرگوں کے اصرار پر فارسی زبان میں سرور المحزون کے نام سے....اس کا ترجمہ کیا، کافی دنوں پہلے کانپور اور حیدرآباد سے چھپ چکا ہے۔

۲۲۔چہل حدیث:

اسلام کے بنیادی اصول پر احادیث جمع کی ہیں، اردو ترجمہ کے ساتھ کئی بار چھپ چکی ہیں، اس کے علاوہ مکتوبات بھی ہیں۔

(ماخوذ: اسلام اور عصر جدید جلد:۱۶، شمارہ:۴، اکتوبر ۱۹۸۴ء)

ضیاء الحسن فاروقی *

تاریخ دعوت وعزیمت: ایک تعارف

شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۷۰۳-۱۷۶۲ء)

ایک عیسائی مستشرق کا خیال ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنے خیالات کے اعتبار سے کلاسیکی کم تھے اور عہد وسطیٰ کے زیادہ، کہنا وہ یہ چاہتے ہیں کہ کلاسیکی اسلام کے زمانے کے بعد مسلم معاشرہ میں جو انحطاط اور خرابیاں پیدا ہوئیں انھیں وہ رد تو کرتے تھے لیکن اس عہد میں وہ مسلمانوں کے کارناموں کو بھی اہم قرار دیتے تھے اور اس کی مجموعی افادیت کے قائل تھے۔ اس فاضل مستشرق نے کلاسیکی اسلام اور عہد وسطیٰ کے اسلام کے حوالے سے شاہ صاحب سے متعلق یہ بات غالباً اس لیے کہی ہے کہ اُسے ان کا موازنہ ان کے ہم عصر محمد ابن عبدالوہاب سے کرنا تھا جو عہد وسطیٰ سے متعلق ہر بات کے، مثلاً علم کلام، تصوف اور مختلف النوع، فقہی دانشوری، سبھی کے مخالف تھے اور سختی سے ان سب کی تردید کرتے تھے۔

اس شمارے میں شاہ صاحب کی حیات اور علمی کارناموں کا ایک مختصر تعارف جو مولانا شاہ

☆ سابق مدیر ''اسلام اور عصرِ جدید'' جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

احمد حسین جعفری کریمی کے قلم سے ہے، شائع کیا جارہا ہے۔لیکن یہاں آج ہم خاص طور سے اس کتاب کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جس کا نام تاریخِ دعوت وعزیمت (حصہ پنجم) ہے اور جس کے مصنف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہیں۔اس عنوان کے تحت چار حصے امام حسن بصریؒ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے شروع ہوکر حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ تک کی عظیم تجدیدی شخصیتوں کی حیات اور کارناموں پر مشتمل ہیں اور یہ پانچواں حصہ احیاء دین، اشاعت کتاب وسنت، اسرار ومقاصد شریعت کی توضیح وتنقیح، تربیت وارشاد اور ہندوستان میں ملت اسلامی کے تحفظ اور تشخص کی بقا کی ان عہد آفریں کوششوں کی روداد (ہے) جن کا آغاز حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے اخلاف وخلفاء کے ذریعہ ہوا۔اس کتاب کے مطالعے سے بخوبی یہ اندازہ ہوجائے گا کہ کلاسیکی وعہد وسطیٰ کے قصہ سے قطع نظر، شاہ صاحب اپنے مذہبی فکر کے اعتبار سے کیسے جدید اور کتنے بڑے مصلح اور مجدد تھے۔پیش لفظ، کتابیات اور انڈکس کے علاوہ اسے حسب ذیل بارہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ عالم اسلام بارہویں صدی ہجری میں۔

۲۔ ہندوستان۔

۳۔ شاہ صاحب کے اجداد ووالد بزرگوار۔

۴۔ مختصر حالاتِ زندگی۔

۵۔ شاہ ولی اللہؒ کے تجدیدی کارنامے، اصلاح عقائد ودعوت الی القرآن۔

۶۔ حدیث وسنت کی اشاعت وترویج اور فقہ وحدیث میں تطبیق کی دعوت وسعی۔

۷۔ شریعت اسلامی کی مربوط ومدلل ترجمانی اور اسرار ومقاصد حدیث کی نقاب کشائی، "**حجة الله البالغه**" کے آئینے میں۔

۸۔ نظام خلافت کی ضرورت وافادیت، خلفائے راشدین کی خلافت کا ثبوت اور ان کے احسانات، کتاب "**ازالة الخفا عن خلافة الخلفاء**" کے آئینے میں۔

۹۔ سیاسی انتشار اور حکومت مغلیہ کے دور اختصار میں شاہ صاحب کا مجاہدانہ وقائدانہ کردار۔

۱۰۔ امت کے مختلف طبقات کا احتساب اور ان کو دعوت اصلاح وانقلاب۔

۱۱۔ فرزندانِ گرامی قدر، خلفائے عالی مرتبت، نامور معاصر۔

۱۲۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تصنیفات۔

پہلے باب میں بارہویں صدی ہجری (اٹھارویں صدی عیسوی) کی دنیائے اسلام کے سیاسی وعلمی ومعاشرتی حالات کا ایک عالمانہ جائزہ پیش کرتے ہوئے مولانا علی میاں صاحب نے ایک بڑے ہی اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے ان کی تاریخی بصیرت اور علمی ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔انھوں نے لکھا ہے:

''مسلمانوں کی علمی وفکری زندگی ونشاط، اوران کی تصنیفی وتحقیقی سرگرمیاں، سیاسی عروج اور سلطنتوں کی ترقی وفتوحات سے مربوط ووابستہ نہیں رہی ہیں، جیسا کہ اکثر غیر مسلم اقوام وملل کی تاریخ میں نظر آتا ہے۔''

یہ کہہ کرانھوں نے آٹھویں صدی کی یعنی تاتاریوں کی خون ریزی اور تاخت وتاراج کے بعد کی بعض نادرۂ روزگار اور نابغۂ عصر شخصیتوں کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:

''اس کی وجہ یہ ہے کہ علوم دینیہ میں کمال پیدا کرنے اور ان کی خدمت واشاعت کے محرکات اس امت کے اندرون اور باطن میں پائے جاتے ہیں، نہ کہ بیرون (حکومتوں کی سرپرستی وقدردانی) میں، اور وہ محرات ہیں رضائے الٰہی کا حصول، نیابت انبیاء کے فرض کی ادائیگی اور دین کی حفاظت کی ذمہ داری کا احساس۔''

پھر اس کی کئی مثالیں دی ہیں، ہمارا خیال ہے کہ اس دور میں یہ مثالیں مولانا ہی دے سکتے تھے کہ ان کی نظر اس وقت کی دنیائے اسلام کے نامور علماء، ان کی تصانیف اور تدریسی سرگرمیوں پر بڑی وسیع اور گہری ہے اور وہی ان تصانیف اور ان علماء کے علمی مقام ومرتبہ کو نقد ونظر کی کسوٹی پر پرکھ کر صحیح رائے پیش کر سکتے تھے۔

لیکن مولانا یہ بھی کہتے ہیں اور واقعی صورتِ حال ایسی ہی تھی کہ ان سب کے باوجود عالم اسلام میں عمومی طور پر جمود وتنزل پایا جاتا تھا، اس جمود وتنزل، اخلاقی ومعاشرتی بگاڑ، سیاسی انتشار، مذہبی توہمات، توحید خالص کے حدود سے تجاوز اور دوسری خرابیوں کا حال اس صدی سے متعلق مسلم معاشروں

پر لکھنے والے کئی مسلم اور غیر مسلم مورخوں نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے، خود ہندوستان اور ہندوستان میں مسلم معاشرہ اپنے سیاسی اور سماجی انتشار کی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔

کتاب کے پہلے چار ابواب شاہ صاحب کی زندگی، شخصیت اور ان کے اصلاحی وتجدیدی کام کی اہمیت وافادیت کی تفہیم کے لیے ایک ایسے مناسب پس منظر کا کام دیتے ہیں جس کے بغیر شاہ صاحب کی تصانیف کی غرض وغایت، مجموعی طور پر ان کی افادیت، شاہ صاحب کی حساس طبیعت اور عبقری شخصیت اور مسلمانانِ ہند کے لیے ان کے اصلاحی وتجدیدی کاموں کی وسعت اور اہمیت کا اندازہ لگانا غالباً ممکن نہیں ہوسکتا ہے یہاں کتاب کے پانچویں باب سے ایک طویل اقتباس درج کرتے ہیں جس سے مذکورہ بالا باتوں کے ساتھ مصنفِ کتاب کی اس خصوصیت کا بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف شاہ صاحبؒ کی بیشتر تصانیف کا گہرا مطالعہ کیا ہے بلکہ ان کے دوررس اثرات اور ان اثرات کے تحت بعد کی دینی وعلمی واصلاحی وعملی تحریکات کو بھی خوب سمجھا ہے جن کا سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔ فاضل مصنف لکھتے ہیں:

> ''شاہ صاحبؒ سے اللہ تعالیٰ نے تجدید واصلاح امت، دین کے فہم صحیح کے احیاء، علوم نبوت کی نشر واشاعت اور اپنے عہد وملت کے فکر وعمل میں ایک نئی زندگی اور تازگی پیدا کرنے کا جو عظیم الشان کام لیا، اس کا دائرہ ایسا وسیع اور اس کے شعبوں میں اتنا تنوع پایا جاتا ہے، جس کی مثال معاصر ہی نہیں، دور ماضی کے علماء ومصنفین میں بھی کم نظر آتی ہے، اس کی وجہ (توفیق وتقدیر الٰہی کے ماسوا) اس عہد کے حالات کا تقاضا بھی ہوسکتا ہے، جو شاہ صاحب کے حصہ میں آیا اور وہ جامعیت، ہمت اور مخصوص تعلیم وتربیت بھی جو شاہ صاحبؒ کے خصائص میں سے ہے۔ ان سب کا نتیجہ تھا کہ شاہ صاحبؒ نے علم وعمل کے اتنے میدانوں میں تجدیدی واصلاحی کارنامہ انجام دیا کہ ان کے سوانح نگار اور اسلام کی تاریخِ دعوت وعزیمت پر قلم اٹھانے والے کے لیے ان کا احتواء اور ان سب کا تفصیلی وتحلیلی جائزہ لینا دشوار ہوگیا ہے اور جو اس کا ارادہ

کرے اس کی زبان بے اختیار فارسی کے اس مشہور شعر کے ساتھ شکوہ سنج ہو جاتی ہے:

دامانِ نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچینِ بہارش تو زردامان گلہ دارد

ہم ان کو اگر علاحدہ علاحدہ بیان کریں تو ان کے حسبِ ذیل عنوانات ہوں گے:

(۱) اصلاح عقائد ودعوت الی القرآن (۲) حدیث وسنت کی اشاعت و ترویج اور فقہ وحدیث میں تطبیق کی دعوت وسعی (۳) شریعت اسلام کی مربوط ومدلل ترجمانی اور اسرار ومقاصد حدیث وسنت کی نقاب کشائی (۴) اسلام میں خلافت کے منصب کی تشریح، خلافت راشدہ کے خصائص اور اس کا اثبات اور ردّ رفض (۵) سیاسی انتشار اور حکومت مغلیہ کے دور احتضار میں شاہ صاحب کا مجاہدانہ وقائدانہ کردار (۶) امت کے مختلف طبقات کا احتساب اور ان کو دعوت اصلاح وانقلاب (۷) علمائے راسخین اور مردان کار کی تعلیم وتربیت جو ان کے بعد اصلاح امت اور اشاعت دین کا کام جاری رکھیں۔''

کتاب وسنت مسلمانوں کے پاس دوا ایسے نسخۂ کیمیا ہیں جو ان کی ہر طرح کی باطنی بیماریوں، اخلاقی خرابیوں اور عقائد کی کمزوریوں کا علاج ہیں، شاہ صاحب نے تو پہلے اپنے زمانے کے مسلم معاشرہ کی بیماریوں کی تشخیص اور پھر ان کے علاج کے لیے قرآن مجید کے مطالعہ وتدبر اور اس کے فہم کو سب سے موثر ذریعہ بتایا جیسا کہ خود قرآن شاہد ہے۔ پھر آپ نے قرآن مجید کا سلیس فارسی زبان میں ترجمہ کیا تاکہ ان پڑھے لکھے مسلمانوں میں جو فارسی سمجھ سکتے تھے اور ان کی تعداد ہندوستان میں جہاں صدیوں سے فارسی دفتری، علمی، تصنیفی اور خط وکتابت کی زبان تھی، بہت تھی، قرآن مجید کی تبلیغ عام ہو، اور پھر تو جیسا کہ فاضل مصنف نے لکھا ہے، قرآن مجید کے ترجمے اور اشاعت کی راہ میں ''جو چٹان حائل ہوگئی تھی وہ شاہ صاحب جیسی عظیم المرتبت ہستی کے اقدام سے (جس کے علمی تبحر) جامعیت، باطنی مرتبے اور

اخلاص پر اس عہد کے صحیح الخیال اور صاحب علم طبقے کا اتفاق تھا) ہٹ گئی اور راستہ صاف ہو گیا۔'' اس کے بعد شاہ صاحب کے بعد جلد ہی ان کے نامور فرزندوں شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ نے اردو میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا، ''یہ دونوں ترجمے مسلمانوں کے گھروں میں ایسے عام ہوئے اور قرآن مجید کی تلاوت کے ساتھ اس کے پڑھنے کا ایسا رواج ہوا کہ جس کی مثال کسی دوسری دینی کتاب کے بارے میں نہیں مل سکتی۔''

شاہ صاحب کا دوسرا کارنامہ حدیث وسنت کی اشاعت وترویج اور فقہ وحدیث میں تطبیق کی دعوت وسعی تھی۔ کتاب کا چھٹا باب یہی ہے اور مطالعے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس باب میں فاضل مصنف نے ایک اہم نکتہ یہ پیش کیا ہے اور جس کی صحت کی تائید تاریخی حقائق سے ہوتی ہے، کہ ''جن ملکوں میں اسلام عربوں کے ذریعہ پہنچا وہاں حدیث کا علم بھی اسلام کے ساتھ پھیلا اور پھلا پھولا۔'' اور جہاں اہلِ عجم کے واسطے سے اسلام پہنچا وہاں یہ صورت نہیں پیش آئی، اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں اور ان میں سے بعض کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ ہندوستان کا بھی یہی حال تھا اور شاہ صاحب کے زمانے تک صورتِ حال یہ ہو چکی تھی کہ حدیث سے بے اعتنائی بڑھ چکی تھی۔ اس صورتِ حال پر شاہ صاحب کا قلب بے چین ہو اٹھا۔ پھر تو شاہ صاحب، ان کے عالی مرتبت فرزندوں اور پھر ان کے خلفاء وتلامذہ کی مساعی اور جدوجہد سے جسے ہم شاہ ولی اللہ کا ''دبستانِ فکر'' کہہ سکتے ہیں، ایک عجمی ملک یعنی ہندوستان میں علم حدیث کا ایسا چرچا ہوا کہ اس عہد جدید میں صاحب فکر ونظر عرب علماء نے ہندوستان کے علمائے حدیث کی خدمات کا برملا اعتراف کیا اور اس کا اعلان کیا کہ اگر علمائے ہند نے حدیث کے علم کی حفاظت واشاعت نہ کی ہوتی تو ہم اس سے محروم ہو گئے ہوتے۔ درحقیقت یہ سارا فیض شاہ صاحبؒ ہی کا تھا جس کا سوتا تو پھوٹا دہلی کے ایک مدرسے میں لیکن سیراب ہوا سارا عرب وعجم۔

مرے زخموں کی رنگینی بیاباں سے چمن تک ہے

شاہ صاحب نے فقہ وحدیث میں تطبیق کے موضوع پر جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا گویا عطر زیر نظر کتاب میں پیش کر دیا گیا ہے اور اس اہم مسئلے کی وضاحت اس انداز سے کی گئی ہے کہ اس کی اہمیت واشگاف ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ مصنف نے ساتواں باب حجۃ اللہ البالغہ پر لکھا ہے، خوب لکھا

ہے اور اس طرح ڈوب کر لکھا ہے کہ اسرار شریعت اور مقاصد حدیث وسنت کے گوہر آبدار نگاہ بصیرت کے سامنے غلطاں نظر آتے ہیں، خود حجۃ کی تفہیم مولانا کے اسلوب نگارش سے بہت آسان اور ایمان پرور ہوگئی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ کئی لحاظ سے اپنی ایک انفرادی شان رکھتی ہے، اس میں ہمیں بیک وقت امام غزالی، ابن تیمیہ اور ابن رشد کی عبقریت کا تجربہ ہوتا ہے اور اس کا احساس ہوتا ہے کہ شریعت کے اسرار وحقائق جس طرح شاہ صاحب نے بیان کیے ہیں، اس طرح پہلے انھیں کسی نے ایک جگہ جمع نہیں کیا تھا۔

فاضل مصنف نے گیارہویں باب میں شاہ صاحب کے ایک معروف معاصر شیخ محمد بن عبدالوہاب کا تذکرہ کیا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاہ صاحب اور محمد بن عبدالوہاب میں ''مماثلت و اتفاق کے نقاط تلاش کرنے کے بجائے شاہ صاحبؒ اور شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کا تقابلی مطالعہ مناسب ہوگا۔ اور اس خیال کے اسباب بھی بتائے ہیں۔ مجھے اس خیال سے بڑی حد تک اتفاق ہے، میرا اپنا خیال ہے کہ شاہ صاحب ابن تیمیہ اور امام غزالی دونوں تھے یعنی اُن میں اِن دونوں نابغۂ روزگار شخصیتوں کی علمی وروحانی عظمت بیک وقت جمع ہوگئی تھی، دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ اپنے وقت کے ابن تیمیہ بھی تھے اور امام غزالی بھی، امید ہے کہ اس رائے کی تائید میں خود فاضل مصنف کو کوئی دقت نہ ہوگی کہ ان کا مطالعہ ان تینوں شخصیتوں کے بارے میں گہرا اور وسیع ہے اور تاریخ دعوت وعزیمت کے سلسلے کے متعلقہ حصے اس کے شاہد ہیں۔

شاہ صاحب کی کتابوں، تفہیمات اور ازالۃ الخفاء وغیرہ کے حوالے اور اقتباسات سے جو علی میاں صاحب کی اس کتاب میں دیے گئے ہیں، شاہ صاحب کی ژرف نگاہی، حکمت ودعوت، اخلاقی جرأت اور واقفیت عامہ وخاصہ کا اظہار ہوتا ہے، اور ان کے سیاسی مکتوبات سے جو ٹکڑے دیئے گئے ہیں اُن سے اُن کے مجاہدانہ کردار، قائدانہ صلاحیت، تدبر اور دوراندیشی کا پتہ چلتا ہے۔

'مردان کار کی تربیت' (گیارہواں باب، صفحہ ۳۷۳) کی ذیلی سرخی کے تحت فاضل مصنف نے شاہ صاحب کے فرزند ارجمند وجانشین گرامی مرتبت شاہ عبدالعزیزؒ سے متعلق یہ لکھ کر ان کے ''ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ایسے متعدد وعالی استعداد اور بلند ہمت وعزیمت رکھنے والے صاحب تاثیر نفوس کی تربیت کا کام لیا جنھوں نے ہزاروں انسانوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا اور ایک

پوری صدی سنبھال لی، اقبال کا مندرجہ ذیل شعر نقل کیا ہے، اس شعر کو نہ معلوم میں نے کتنی بار پڑھا اور گنگنایا ہوگا، لیکن اس کی بلاغت اور معنویت کا جو لطف اس موقع پر آیا اس کا تجربہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، اقبال نے کہا ہے:

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

(ماخوذ: اسلام اور عصر جدید جلد:۱۶، شمارہ:۴، اکتوبر ۱۹۸۴ء)

مغیث احمد *

ترجمۂ مثنوی معنوی
قاضی سجاد حسین — تنقیدی مطالعہ

(۲)

'مست حق' معذور جیسا ہی ہے

مولانا رومی نے قرآن کریم میں موجود بڑے بڑے مسائل کو اپنے ایک دو مصرعوں میں ہی سمیٹ دیا ہے جس سے مولانا رومی کی قرآن پر گہری نظر اور اس کی منشا پر باریک نگاہ ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ قرآن مقدس کی ایک آیت ہے "**لیس علی الاعمی حرج الخ**" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

بار بر گیرند چون آمد حرج
گفت حق 'لیس علی الاعمیٰ حرج'
ہمچنین 'لیس علی الاعرج حرج'
نیست رنجی چون عمی و چون عرج
بار کہ نہد در جہان خر کرہ را

*اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی، یوپی ای میل: moghees.ahmad5@gmail.com

درس کہ دہد پارسی بو مرہ را
سوی خود اعمیٰ شدم از حق بصیر
پس معافم از قلیل و از کثیر
لاف درویشی زنی و بیخودی
ہای و ہوی عاشقان ایزدی
کہ زمین را من ندانم ز آسمان
امتحانت کرد غیرت امتحان
باد خر کرہ چنین رسوات کرد
ہستی نفی ترا اثبات کرد
این چنین رسوا کند حق شید را
این چنین گیرد رمیدہ صید را
صد ہزاران امتحانست ای پدر
ہرکہ گوید من شدم سرہنگ در
گر نداند عامہ او را امتحان
پختگان راہ جویندش نشان

(ترجمہ) ''جب لنگڑا پن آ جاتا ہے، بوجھ اٹھا لیتے ہیں، اللہ (تعالیٰ) نے فرمایا، اندھے پر گناہ نہیں ہے۔ اسی طرح لنگڑے پر گناہ نہیں ہے، اندھے پن اور لنگڑے پن کی طرح کوئی مصیبت نہیں ہے۔ گدھے کے بچے پر بوجھ کون لادتا ہے؟ فارسی کا سبق شیطان کو کون پڑھاتا ہے؟ اپنے لیے میں اندھا ہوں، خدا کے معاملہ میں بینا ہوں، تو مجھے تھوڑے اور زیادہ سے معافی ہے۔ تو درویشی اور بے خودی کی ڈینگیں مارتا ہے، اللہ کے عاشقوں جیسی ہائے وہو (کرتا ہے)۔ کہ میں آسمان اور زمین میں فرق نہیں کرسکتا ہوں، غیرت (خداوندی) نے تیرا خوب امتحان کیا۔ گدھے

کے بچے کے گوز نے تجھے رسوا کر دیا، تیری ہستی کی نفی (کے جھوٹ) کا اثبات کر دیا۔ اللہ (تعالی) مکر کو اسی طرح رسوا کرتا ہے، بھاگے ہوئے شکار کو اسی طرح پکڑتا ہے۔ باوا! لاکھوں آزمائشیں ہیں (اس کے لیے) جو یہ کہے کہ میں (اللہ کے) در کا سپاہی ہوں۔ اگر چہ عوام اس کو امتحان نہیں سمجھتے، (لیکن) راہ (حق) کے پختہ (کار) اس کا پتہ لگا لیتے ہیں۔''[۱]

یعنی جیسے ایک شخص کام کرتے ہوئے لنگڑایا معذور ہو جائے تو پھر اسے رخصت دے دی جاتی ہے، وہی رویہ خالق کے عشق میں مست اور مجذوب ہوئے لوگوں کے ساتھ بھی اختیار کرنا چاہیے۔

ہر حال میں سچائی اختیار کرو

'مثنوی معنوی' کے دفتر سوم میں 'بردن گربہ دنبہ را و رسوا شدن پہلوان' کے عنوان کے تحت مولانا رومی لوگوں کو ہر حال میں سچائی کا راستہ اختیار کرنے کی نصیحت کرتے ہوئے ایک جوان کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک نوجوان جو اپنے دوستوں کی محفل میں بہت شیخیاں بگھاڑا کرتا تھا اور اپنی مونچھ پر دنبے کی چربی رگڑ کر یہ ظاہر کیا کرتا تھا کہ وہ ہر روز اچھی غذائیں تناول کرتا ہے۔ اتفاقاً ایک دن کہیں سے ایک بلی آئی اور گھر میں رکھی دنبے کی چربی لے کر چمپت ہو گئی۔ اس شیخی خورے کا لڑکا بہت گھبرایا اور بلی کے پیچھے بھاگا مگر نتیجہ لاحاصل رہا۔ بالآخر وہ اس حادثے کی خبر شیخی خورے کو بتانے کے لیے بھاگا، ادھر شیخی خورا اپنے دوستوں کی محفل میں شیخی بگھاڑنے میں مصروف تھا، تبھی اس کا لڑکا محفل میں داخل ہو کر کہتا ہے کہ 'دنبے کی وہ چربی جو تم ہر صبح اپنی مونچھوں پر رگڑ کر محفل میں آیا کرتے تھے، اسے بلی لے کر بھاگ گئی' یہ ماجرا سنتے ہی پوری محفل میں قہقہوں کی آوازیں گونجنے لگتی ہیں اور شیخی خورا مارے شرمندگی کے سر جھکا لیتا ہے۔ بعد میں اس کے دوستوں کو اس شیخی خورے کی غربت، مسکنت اور حالت فقر پر ترس بھی آتا ہے، چنانچہ اس کے دوست اس شیخی خورے کی امداد کرتے ہیں اور اسے اچھے کھانوں اور غلوں سے نوازتے ہیں۔ جس سے متاثر ہو کر وہ سچائی کا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ ذیل میں 'مثنوی معنوی' کے

اشعار ملاحظہ فرمائیں:

چون شکم خود را بہ حضرت در سپرد
گربہ آمد پوست آن دنبہ ببرد
از پس گربہ دوید او می گریخت
کودک از ترس عتابش رنگ ریخت
آمد اندر انجمن آن طفل خورد
آبروی مرد لافی را ببرد
گفت آن دنبہ کہ ہر صبحی بدان
چرب میکردی لبان و سبلتان
گربہ آمد ناگہانش در ربود
بس دویدیم و نکردن آن ہیچ سود
پہلوان در لاف گرم و ذوقناک
چون شنید این قصہ گشت از غم ہلاک
منفعل شد درمیان انجمن
سر فرو برد و خمش گشت از سخن
خندہ آمد حاضران را از شگفت
رحمہا شان باز جنبیدن گرفت
دعوتش کردند و سیرش داشتند
تخم رحمت در زمینش کاشتند
او چو ذوق راستی دید از کرام
بی تکبر راستی را شد غلام
راستی را پیشۂ خود کن مدام
تاشوی در ہردوعام نیک نام

(ترجمہ) ''جب پیٹ نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا، بلی آئی، دنبہ کی کھال لے بھاگی۔ بلی کے پیچھے دوڑا، وہ بھاگ گئی، اس کے غصہ کے ڈر سے بچہ کا رنگ بدل گیا۔ وہ چھوٹا بچہ مجمع میں آیا، اس نے شیخی خورے کی آبرو کھودی۔ کہنے لگا کہ وہ دنبہ (کی کھال) جس سے ہر صبح کو، وہ ہونٹ اور مونچھیں چکنی کرتا تھا۔ بلی آئی اور اچانک اس کو لے بھاگی، میں بہت دوڑا اور کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پہلوان نے شیخی کی گرمی اور ذوق میں، جب یہ قصہ سنا، رنج سے ہلاک ہوگیا۔ مجمع میں شرمندہ ہوگیا، سر جھکالیا اور بات سے خاموش ہوگیا۔ تعجب سے حاضرین کو ہنسی آ گئی، ان کا رحم پھر حرکت کرنے لگا۔ انھوں نے اس کی دعوت کی اور اس کا پیٹ بھر دیا، مہربانی کا بیج اس کی زمین میں بو دیا۔ جب اس نے شریفوں میں سچائی کا ذوق دیکھا، بغیر تکبر کے سچائی کا غلام بن گیا۔ سچائی کو ہمیشہ کے لیے اپنا پیشہ بنالے، تاکہ تو دونوں جہان میں نیک نام بنے۔''[۲]

دنیا کے ذریعہ آخرت کا تصور کرنا مشکل

مولانا رومی جب بھی کسی مسئلہ کو بیان کرتے ہیں تو اسے ذہن نشین کرانے کے لیے کئی طرح کی تمثیلات و واقعات سے اتنی وضاحت کر دیتے ہیں کہ اس میں شک وشبہ کی ذرہ برابر بھی گنجائش باقی نہیں رہتی اور قاری یا سامع کے دل و دماغ میں وہ بات ازبر ہوجاتی ہے۔

مولانا رومی لکھتے ہیں کہ ہم اخروی اشیا کے احوال کو دنیوی اشیا پر محمول نہیں کر سکتے، دونوں کی حالتیں اور طبیعتیں بالکل علاحدہ اور مختلف ہیں، دونوں کی اہمیت و معنویت الگ الگ ہے۔ بہت سی چیزیں دنیوی اعتبار سے بے جان ہوکر بھی جانداروں سے زیادہ متحرک ہوجاتی ہیں۔ مولانا رومی نے اس مسئلے کو کئی مثالوں سے واضح کیا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں کہ دنیا و آخرت کی چیزیں اپنے موقع و محل کے اعتبار سے زندہ اور مردہ، ناطق و غیر ناطق ہیں، جب تک جسم انسانی زندہ ہے، تب تک وہ اخروی محسوسات کے لیے مردہ ہے، اسی طرح جو چیزیں دنیاوی اعتبار سے خاموش اور مردہ ہیں ممکن ہے کہ

وہ اخروی اعتبار سے گویا ہوں۔ موسیٰ کا عصا بے جان تھی مگر عظیم اژدہا کی شکل اختیار کر کے اس نے بے شمار اژدہوں کو اپنا لقمہ بنالیا، لوہا حضرت داؤدؑ کے دست مبارک میں موم کی شکل اختیار کر لیتا تھا، ہوا حضرت سلیمانؑ کی سواری بن جاتی تھی اور دریا حضرت موسیٰؑ کا دوست بن گئی تھی، چاند میں اشاروں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور آگ حضرت ابراہیمؑ کے حق میں ایئر کنڈیشن جگہ بن جاتی ہے، ہزاروں اور لاکھوں مخلوق کے بوجھ کو اپنے سینے پر ڈھونے والی زمین قارون کو سانپ کی طرح نگل جاتی ہے اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق میں 'استن حنانہ' بلک بلک کر رونے لگتا ہے، کنکریوں میں قوت گویائی پیدا ہو جاتی ہے اور پہاڑ حضرت یحییٰؑ کو پیغام رسانی کا کام انجام دینے لگتا ہے، غرضیکہ دنیا کی سبھی چیزیں حتی کہ جمادات و ذرات در پردہ زبان حال سے یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ہم سنتے ہیں، دیکھتے ہیں اور خوش بھی ہوتے ہیں، البتہ تم نامحرموں کے سامنے خاموش رہتے ہیں۔ اسی بات کو مولانا رومی اپنی 'مثنوی معنوی' کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں، مرقومہ ذیل اشعار اور اس کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

مردہ زین سویند زانسو زندہ اند
خامش اینجا وان طرف گویندہ اند
چون ازان شوشان فرستد سوی ما
آن عصا گردد سوی ما اژدہا
کوہ ہا ہم لحن وادی کند
جوہر آہن بکف مو می شود
باد حمال سلیمانی شود
بحر با موسیٰ سخندانی شود
ماہ با احمد اشارت بین شود
نار ابراہیم را نسرین شود
خاک قارون را چو ماری درکشید
استن حنانہ آید رشد

سنگ احمد را سلامی میکند
کوہ یحییٰ را پیامی می کند
جملہ ذرات عالم درنہان
باتو میگویند روزان و شبان
ما سمیعیم و بصیریم و خوشیم
با شما نا محرما ن ما خامشیم

(ترجمہ) ''وہ اس جانب مردہ ہیں اوراس جانب زندہ ہیں، اس جگہ چپ ہیں، اس جانب بولنے والی ہیں۔ جب وہ ان چیزوں کو اس جانب سے ہماری جانب بھیجتا ہے، وہ لاٹھی ہماری جانب (آ کر) اژدہا بن جاتی ہے۔ پہاڑ بھی داؤدی لہجہ اختیار کر لیتے ہیں، لوہے کا جوہر ہاتھ میں موم بن جاتا ہے۔ ہوا، ایک سلیمان کو اٹھالے جانے والی بن جاتی ہے، سمندر، موسیٰ کی بات سمجھنے والا بن جاتا ہے۔ چاند (حضرت) احمدؐ کے اشارے کو دیکھنے والا بن جاتا ہے، آگ (حضرت) ابراہیم کے لیے نسرین بن جاتی ہے۔ زمین قارون کو اژدہے کی طرح نگل لیتی ہے، حنانہ ستون ہوش میں آجاتا ہے۔ پتھر (حضرت) احمدؐ کو سلام کرتا ہے، پہاڑ (حضرت) یحییٰ کو پیغام دیتا ہے۔ دنیا کے تمام ذرات پوشیدہ طور پر، تجھ سے شب و روز کہتے ہیں۔ ہم سننے والے ہیں اور دیکھنے والے ہیں اور خوش ہیں، تم نامحرموں کے سامنے ہم خاموش ہیں۔''[۳]

ہاتھی کا واقعہ

مولانا رومی کی تمثیلات سے ان کی تخلیقی پرواز کی بلندی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ 'مثنوی معنوی' کے ان اشعار کو دیکھیں جن میں ہاتھی دیکھنے والوں کا قصہ بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ 'ایک ہاتھی جو اندھیرے حجرے میں تھا۔ لوگوں کا ایک جم غفیر اسے دیکھنے کے لیے آیا، اندھیرے میں

ہاتھی کا دیدار تو نہیں ہوسکا، البتہ ان میں سے ہر شخص نے اپنے ہاتھوں سے چھو کر اسے محسوس کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے کسی کا ہاتھ سونڈ پر پڑا تو کسی کا کان پر، کسی کا ہاتھ پیر سے ٹکرایا تو کسی کا ہاتھی کی کمر سے۔ اس طرح ہر ایک نے اپنے اپنے محسوسات کے اعتبار سے پرنالہ، پنکھا، ستون اور تخت سمجھ لیا۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد مولانا رومی فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں بھی جس شخص کی قوت بصارت صرف ہتھیلی کی طرح ہے اس کی رسائی پورے ہاتھی تک ممکن نہیں۔ دریا کا تصور کرنا الگ بات ہے اور اس کے جھاگ کا تصور کرنا کچھ اور ہے، لہذا جھاگ کو چھوڑ کر تم اپنی آنکھوں سے سمندر کو دیکھنے کی کوشش کرو۔ اب 'مثنوی معنوی' کے اشعار اور اس کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

پیل اندر خانۂ تاریک بود
عرضہ را آوردہ بودندش ہنود
از برای دیدنش مردم بسی
اندران ظلمت ہمی شد ہرکسی
دیدنش با چشم چون ممکن نبود
اندران تاریکیش کف می بسود
آن یکی را کف بخرطوم اوفتاد
گفت ہمچو ناد دانست این نہاد
آن یکی را دست بر گوشش رسید
آن برو چون باد بیزن شد پدید
آن یکی را کف چو بر پایش بسود
گفت شکل پیل دیدم چون عمود
آن یکی بر پشت او بنہاد دوست
گفت خود این پیل چون تختی بدست
ہمچنین ہر یک بجز وی کو رسید
فہم آن می کرد ہرجا می شنید

از نظر گہ گفت شان شد مختلف
آن یکی دالش لقب داد این الف
در کف ہر یک اگر شمعی بدی
اختلاف از گفت شان بیرون شدی
چشم حس ہمچون کف دستست و بس
نیست کف را بر کل او دسترس
جسم دریا دیگر ست و کف دگر
کف بہل وز دیدہ در دریا نگر

(ترجمہ) ''ہاتھی ایک اندھیرے گھر میں تھا، ہندوستانی اس کو پیش کرنے کے لیے لائے تھے۔ بہت سے لوگ اس کو دیکھنے کے لیے، ہر شخص اندھیرے میں گھس آیا۔ چونکہ اس کا آنکھوں سے دیکھنا ممکن نہ تھا، اندھیرے میں اس پر ہاتھ پھیرتا تھا۔ایک کا ہاتھ سونڈ پر پڑا،اس نے کہا، یہ جسم پرنالے کی مانند ہے۔ایک کا ہاتھ اس کے کان پر پہنچا،اس کو وہ پنکھے کی طرح معلوم ہوا۔ایک کا ہاتھ جب اس کے پیر پر لگا،اس نے کہا، میں نے ہاتھی کو ستون جیسا دیکھا ہے۔ایک نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھا،اس نے کہا، یہ ہاتھی تخت کی طرح کا ہے۔اسی طرح ہر وہ شخص جو کسی ایک عضو تک پہنچا تھا، جہاں کہیں (ہاتھی کا نام) سنتا وہی خیال کرتا۔ان کی بات نقطۂ نظر کی وجہ سے مختلف ہوگئی،اس ایک نے اس کو دال کا لقب دیا،اس نے الف کا۔ ہر ایک کے ہاتھ میں اگر شمع ہوتی،تو ان کی باتوں سے اختلاف دور ہو جاتا۔ جس کی آنکھ صرف ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح ہے، ہتھیلی کی اس کے مجموعہ پر پہنچ نہیں ہے۔ دریا کا وجود اور ہے اور جھاگ اور ہیں، جھاگ کو چھوڑ اور آنکھ سے دریا کو دیکھ۔''[۴]

یہ چند مثالیں ہیں جن سے قاضی سجاد حسین کے ترجمہ کی خوبیوں اور مفہوم کی ترسیل میں ان

کے کمالات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ البتہ ان کے علاوہ کچھ ایسے مقامات بھی ہیں جہاں متن کے مقابلہ میں ترجمہ کا دامن کافی تنگ نظر آتا ہے، کچھ جگہوں پر علاقائی زبان کے استعمال سے ترجمہ کافی سپاٹ ہوگیا ہے اور کہیں کہیں پر لفظ کے مطابق ترجمہ نہیں ہوسکا ہے، بعض جگہوں پر ترجمے کی زبان میں مروج الفاظ کا بھی غیر ضروری طور پر ترجمہ کردیا گیا ہے جو ترجمہ نگاری کے لیے غیر مستحسن مانا جاتا ہے، سبھی شقوں کا احاطہ کرنا یہاں ممکن نہیں۔ ذیل میں کچھ مثالیں پیش کی جارہی ہیں، جن سے قاضی سجاد حسین کے ترجمہ میں درآئیں تسامحات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

نصیحت کا حقدار کون ہے؟

کہا جاتا ہے کہ نصیحت اسی کو کرنی چاہیے جو نصیحت کو قبول کرے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے، ہر شخص کو نصیحت کرنا اپنے وقت کو ضائع کرنے جیسا ہے۔ مولانا رومی اسی بات کو ایک پرندے کی زبانی سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولانا رومی کہتے ہیں کہ ایک پرندہ جو کسی شکاری کے چنگل میں پھنس جاتا ہے، لہذا رہائی کی تدبیریں تلاش کرنے لگتا ہے۔ بالآخر وہ شکاری سے مخاطب ہوکر کہتا ہے' اے میرے مالک! تم نے مجھ جیسے بہت سے پرندوں کا شکار کیا، مجھ سے بہت بڑے جانوروں کے شکار بھی کھائے، لیکن پھر بھی تجھے آسودگی حاصل نہیں ہوئی، لہذا اس بار بھی تجھے سیرابی حاصل نہ ہوسکے گی۔ لیکن اگر تم میری جان بخش دو تو میں تمہیں تین ایسی نصیحتیں کروں گا جو تمہاری زندگی کے ہر موڑ پر کام آئیں گی۔ پھر وہ پرندہ شکاری سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ یہ تین نصیحتیں تین شرطوں کے ساتھ ہیں، اگر تمہیں میری شرط منظور ہے تو بتاؤ۔ مالک کی رضامندی پر پرندہ اپنی شرطیں بیان کرتا ہے کہ میں اپنی پہلی نصیحت تمہاری ہتھیلی پر بیٹھ کر کروں گا۔ دوسری نصیحت دیوار پر بیٹھ کر کروں گا اور تیسری نصیحت درخت کی ڈالی پر بیٹھ کر کروں گا۔

شکاری اسے آزاد کردیتا ہے۔ پرندہ اڑ کر شکاری کی ہتھیلی پر جا بیٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ میری پہلی نصیحت یہ ہے کہ کسی بھی غیر یقینی اور ناممکن بات پر اس وقت تک یقین مت کرنا جب تک کہ اس کا مشاہدہ نہ کرلینا۔ یہ کہتے ہوئے وہ اڑ کر دیوار پر چلا جاتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ میری دوسری نصیحت یہ ہے کہ جو چیز تمہاری ملکیت سے چلی جائے اس پر افسوس مت کرنا اور یہ کہہ کر پرندہ پیڑ کی

ڈال پر جا بیٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ نادان شکاری تم نے مجھے آزاد کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے، کیونکہ میرے اندر دس درم کا موتی تھا جو تمہاری پوری نسل کی کفالت کے لیے کافی تھا مگر تم نے مجھے آزاد کر کے وہ ساری دولت خاک میں ملا دی۔ یہ سنتے ہی شکاری بے چین ہو اٹھتا ہے اور پرندے کو کوسنا شروع کر دیتا ہے کہ اے پرندے! تو فریبی، دغاباز اور جھوٹا ہے۔تم نے جھوٹ بول کر اور مکاری کر کے مجھ سے رہائی حاصل کر لی اور مجھے اتنے بڑے خسارے میں ڈال دیا، اے کاش میں تجھ کو آزاد نہ کرتا۔ یہ سن کر پرندہ کہتا ہے کہ اے بیوقوف انسان میں نے تمہیں شروع میں ہی یہ نہیں کہا تھا کہ 'جو چیز ناقابل یقین ہو اس پر یقین نہ کرنا'۔ میں ایک معمولی پرندہ جو خود تین درم کا ہوں تو بھلا میرے اندر دس درم کا موتی کیسے ہو سکتا ہے؟ اسی طرح جو چیز تمہارے ہاتھوں سے چلی گئی اس پر تم نے افسوس کیوں کیا۔ یہ سن کر شکاری کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور تیسری نصیحت سنانے کے لیے کہتا ہے۔ جس کے جواب میں پرندہ کہتا ہے کہ جب تم نے میری پہلی دو نصیحتوں پر عمل نہیں کیا تو پھر تمہیں تیسری نصیحت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس بات میں خود ایک نصیحت پوشیدہ تھی کہ جو شخص کسی کی نصیحت پر عمل نہ کرے تو اسے بلا وجہ نصیحت کرنا اپنا وقت ضائع کرنے جیسا ہے۔ اب 'مثنوی معنوی' کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

آن یکی مرغی گرفت از مکر و دام
مرغ او را گفت کای خواجہ ہمام
تو یکی مرغی ضعیفی ہیچو من
صید کردہ خوردہ گیر ای نیک ظن
تو بسی گاوان و میشاں خوردۂ
تو بسی اشتر بقربان کردۂ
تو نگشتی سیر زانہا در زمن
ہم نگردی سیر از اجزای من
مر مرا آزاد گردان از کرم
ای جوان مرد کریم محتشم

ہل مرا تاکہ سہ پندت بردہم
تا بدانی زیرکم یا ابلہم
اول آن پندی دہم بر دست تو
بدہمت ای جان و دل سرمست تو
بر سر دیوار بدہم ثانیش
تا شوی زان پند شاد و خوب و گش
وان سوم پندت دہم من بر درخت
کہ ازین سہ پند گردی نیک بخت
آنچہ بر دست ست اینست آن سخن
کہ محالی را ز کس باور مکن
بر کفش چون گفت اول پند رفت
گشت آزاد و بر آن دیوار رفت
گفت دیگر بر گذشتہ غم مخور
چون ز تو بگذشت زان حسرت مخور
بعد ازان گفتش کہ در جسمم کتیم
دہ درم سنگ ست یک در یتیم
دولت تو بخت فرزندان تو
بود آن گوہر بحق جان تو
فوت کردی در کہ روزیت نبود
کہ نباشد مثل آن در در وجود
آنچنان کہ وقت زادن حاملہ
نالہ دارد خواجہ شد در غلغلہ
گشت غمناک و ہمیگفت آہ آہ

این چرا کردم که شد کارم تباه
من چرا آزاد کردم مر ترا
زین حیل از راه بردی مرمرا
مرغ گفتش نی نصیحت کردمت
که مبادا برگذشته دی غمت
چون گذشت و رفت غم چون میخوری
یا نکردی فهم پندم یا کری
وان دوم پندت بگفتم کز ضلال
هیچ تو باور مکن قول محال
من نیم خود سه درم سنگ ای اسد
ده درم سنگ اندرونم چون بود
خواجه باز آمد بخود گفتا که هین
باز گو پند سوم ای نازنین
گفت آری خوش عمل کردی بدان
تا بگویم پند ثالث رایگان
این بگفت و بر پرید و شاد رفت
سوی صحرا سر خوش و آزاد رفت
پند گفتن با جهول خوابناک
تخم افگندن بود در شوره خاک
چاک حمق و جهل نپذیرد رفو
تخم حکمت کم دهش ای پندگو
زانکه جاهل جهل را بنده بود
چونکه تو پندش دهی او نشنود

قاضی سجاد حسین کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

''ایک شخص نے ایک پرند مکر و جال سے پکڑ لیا، اس سے پرند نے کہا کہ اے خواجۂ بزرگ!؛ تو نے مجھ جیسے ایک کمزور پرند کو شکار کر لیا، فرض کر کھا لیا، اے نیک گمان!؛ تو نے بہت سی گائیں اور بھیڑیں کھائی ہیں، تو نے بہت سے اونٹ قربان کیے ہیں؛ تو زمانہ میں ان سے پیٹ بھرا نہ بنا، میرے اجزا سے بھی تیرا پیٹ نہ بھرے گا؛ کرم کر کے مجھے آزاد کر دے، اے شریف! معزز جوان شخص!؛ مجھے چھوڑ دے تا کہ تجھے تین نصیحتیں کر دوں، حتی کہ تجھے معلوم ہو جائے کہ میں عقلمند ہوں یا بیوقوف ہوں؛ ان میں کی پہلی نصیحت میں تیرے ہاتھ پر (بیٹھے ہوئے) تجھے کر دوں گا، اے وہ کہ دل و جان تیرے شیدائی ہیں؛ ان میں سے دوسری دیوار پر (بیٹھ کر) کروں گا، تا کہ تو اس نصیحت سے خوش اور بھلا اور نازاں ہو؛ میں تیسری نصیحت تجھے درخت پر پہنچ کر کروں گا، تا کہ تو ان تینوں نصیحتوں سے نیک بخت بن جائے؛ جو ہاتھ پر (بیٹھے ہوئے کرنی ہے) وہ یہ بات ہے کہ ناممکن (بات) پر کسی کا یقین نہ کر؛ اس کے ہاتھ پر (بیٹھے ہوئے) جب پہلی (نصیحت) کہہ دی اڑ گیا، آزاد ہو گیا اور دیوار پر جا بیٹھا؛ دوسری نصیحت کی کہ گزری ہوئی (بات) پر غم نہ کر، جب تجھ سے گزر گئی، اس پر حسرت نہ کر؛ اس کے بعد اس نے اس سے کہا کہ میرے جسم میں چھپا ہوا، دس درہم کے وزن کا ایک نادر موتی ہے؛ تیری دولت تیری اولاد کا نصیبہ تھا وہ موتی تیری جان کی قسم!؛ تو نے وہ موتی کھو دیا چونکہ تیرے مقدر میں نہ تھا کہ جس موتی کی مثال وجود میں نہ ہوگی؛ جس طرح حاملہ (عورت) جننے کے وقت فریاد کرتی ہے (وہ شکاری) خواجہ شور کرنے لگا؛ غمگین ہو گیا اور کہتا تھا، ہائے ہائے یہ میں نے کیوں کیا؟ کہ میرا کام برباد ہو گیا؛ میں نے تجھے کیوں آزاد کیا؟ تو نے

ان حیلوں سے مجھے گمراہ کر دیا؛ پرندے نے اس سے کہا کہ میں نے تجھے نصیحت نہیں کر دی؟ کہ کل کی گذشتہ (بات) پر تو غمگین نہ ہو؛ جب کہ رفت وگذشت ہوگئی تو کیوں غم کرتا ہے؟ یا تو میری نصیحت نہیں سمجھا ہے، یا تو بہرا ہے؛ میں نے دوسری نصیحت تجھے کی کہ گمراہی سے تو کبھی ناممکن (بات) کا یقین نہ کرنا؛ میں خود تین درہم بھر نہیں ہوں، اے شیر! دس درہم کا وزن میرے اندر کیسے ہوگا؟ ؛ خواجہ ہوش میں آیا، بولا کہ ہاں، اے نازنین! تیسری نصیحت کر؛ اس نے کہا ہاں تو نے ان (دو) پر اچھا عمل کیا تا کہ میں فضول تیسری نصیحت کروں؛ اس نے یہ کہا اور اڑ گیا اور خوش (ہوکر) چل دیا مست اور آزاد جنگل کی جانب چلا گیا؛ ناداں، جاہل کو نصیحت کرنا، شوریلی زمین میں بیج بونا ہوتا ہے؛ حماقت اور نادانی کا چاک رفو کے قابل نہیں ہے، اے نصیحت کرنے والے! اس میں دانائی کا بیج نہ بو؛ کیونکہ جاہل، جہل کا غلام ہوتا ہے جب تو اسے نصیحت کرے گا وہ نہ سنے گا۔''[۵]

'سیر' کا معنی 'آسودہ حال ہونا، مطمئن ہونا، جی بھرنا' ہوتا ہے۔ جب کہ مترجم نے چوتھے شعر میں 'سیر' کا ترجمہ 'پیٹ بھرا' کیا ہے جو غریب لفظ ہونے کی وجہ سے اٹ پٹا سا معلوم ہوتا ہے۔ آگے چل کر ایک شعر 'برسر دیوار بدہم ثانیش؛ تا شوی زان پند شاد وخوب وگش' یہ شعر صرف قاضی صاحب کے متن میں موجود ہے، جب کہ دوسرے نسخوں نہیں ہے، جب کہ 'منہج' میں ان دونوں اشعار کی بجائے 'اول آن پندت دھم بردست تو: ثانی بر دیوار کھگل بست تو' مذکور ہے۔

انسان کی اصل خوبی اس کی خوش خلقی ہے

انسان عام طور پر مال، جمال، کمال یا حسب ونسب پر فخر کرتا ہے مگر مولانا رومی نے ایک بادشاہ اور اس کے پروردہ غلام کا واقعہ بیان کر کے مندرجہ بالا صفات کی ناپائیداری اور اس کے ہیچ ہونے کے دعوے کو مع دلائل وامثلہ بیان کرتے ہیں، مولانا رومی کہتے ہیں کہ اصل پائیداری دینداری اور

پرہیزگاری ہے جو ہمیشہ کام آتی ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ جس طرح اس ہندی غلام کو دھوکہ ہوا اسی طرح دنیا کا ہر شخص دھوکہ، فریب اور خسارے میں ہے الا یہ کہ خدا اسے بچالے۔ اللہ کا فرمان ہے: ''ان **الانسان لفی خسر**'' (کہ بلاشبہ انسان خسارے میں ہے)۔ اب 'مثنوی معنوی' کے اشعار اور قاضی سجاد حسین کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

خواجہ را بود ہندو بندۂ
پروریدہ کردہ او را زندۂ
علم و آدابش تمام آموختہ
در دلش شمع ہنر افروختہ
پروریدش از طفولیت بناز
در کنار لطف آن اکرام ساز
بود ہم این خواجہ را یک دخترے
سیم اندامے گشے خوش گوہرے
چون مراہق گشت دختر طالبان
بذل می کردند کابینِ گران
می رسیدش از سوی ہر مہتری
بہر دختر دمبدم خواہش گری
گفت خواجہ مال را نبود ثبات
روز آید شب رود اندر جہات
حسن صورت ہم ندارد اعتبار
کہ شود رخ زرد از یک زخم خار
سہل باشد نیز مہتر زادگی
کہ بود غرہ بمال و بارگی
ای بسا مہتر بچہ کز شور و شر

شد ز فعل زشت خود ننگ پدر
پر ہنر را نیز اگر باشد نفیس
کم پرست و عبرتی گیر از بلیس
علم بودش چون نبودش عشقِ دین
او ندید از آدم الا نقش طین
گرچہ دانی دقت علم ای امین
زانت نگشاید دو دیدہ غیب بین
چون نبیند غیر دستاری و ریش
از معرف پرسد از بیش و کمیش
عارفا تو از معرف فارغی
خود ہمی بینی کہ نور بازغی
کار تقویٰ دارد و دین و صلاح
کہ ازو باشد بدو عالم فلاح
کرد یک داماد صالح اختیار
کہ بد او فخر ہمہ خیل و تبار
پس زنان گفتند او را مال نیست
مہتری و حسن و استقلال نیست
گفت آنہا تابع زہد اند و دین
بی زر او گنجی ست بر روی زمین
چون بجد تزویج دختر گشت فاش
دست پیمان و نشانی و قماش
پس غلام خواجہ کاندر خانہ بود
گشت بیمار و ضعیف و زار زود

ہمچو بیمار دقی او می گداخت
علت او را طبیبی کم شناخت
عقل می گفتی کہ رنجش از دل ست
داروی تن در غم دل باطل ست
آن غلامک دم نزد از حال خویش
گرچہ می آمد ورا در سینہ ریش
گفت خاتون را شہی شوہر کہ تو
باز پرسش در خلا از حال او
تو بجای مادری او را بود
کو غم خود پیش تو پیدا کند
چونکہ خاتون کرد در گوش این کلام
روز دیگر رفت نزدیک غلام
پس سرش را شانہ می کرد آن ستی
باد و صد مہر و دلال و دوستی
آن چنان کہ مادرانِ مہربان
نرم کردش تا در آمد در بیان
کہ مرا امید از تو این نبود
کہ دہی دختر بہ بیگانہ عنود
خواجہ زادہ ما و ما خستہ جگر
حیف نبود کو رود جای دگر
خواست آن خاتون زخشمی کامدش
کش زند وز بام زیر اندازدش
کو کہ باشد ہندوی مادر غری

کہ طمع دارد بخواجہ دختری
گفت صبر اولیٰ بود خود را گرفت
گفت با خواجہ کہ بشنو این شگفت
این چنین گرایکی خائن بود
ما گمان بردہ کہ ہست او معتمد
حال خود را این چنین گفت او مرا
خواستم کز خشم بکشم مرورا

قاضی سجاد حسین کا ترجمہ دیکھیں:

(ترجمہ) ''ایک آقا کا ایک ہندوستانی غلام تھا، جس کو اس نے پرورش کر کے زندہ کر دیا؛ اس کو سب علم اور آداب سکھائے، اس کے دل میں ہنر کی شمع روشن کر دی؛ اس کو بچپن سے ناز سے پالا، اس کرم کرنے والے نے، مہربانی کے پہلو میں؛ اس آقا کے ایک لڑکی بھی تھی، چاندی کے بدن والی، حسین، خوش مزاج؛ جب لڑکی بلوغ کے قریب ہوئی، طلبگار بھاری مہر خرچ کرنے لگے؛ اس کے پاس ہر سردار کی جانب سے پہنچتا، ہر لمحہ لڑکی کے لیے درخواست کرنے والا؛ آقا نے کہا، مال کے لیے ٹکاؤ نہیں، دن میں آتا ہے رات کو ادھر ادھر چلا جاتا ہے؛ صورت کا حسن بھی اعتبار نہیں رکھتا، کیونکہ چہرہ ایک کانٹے کے زخم سے زرد ہو جاتا ہے؛ سردار کا بیٹا ہونا بھی معمولی ہوتا ہے، کیونکہ وہ مال اور گھوڑے پر مغرور ہوتا ہے؛ بہت سے رئیس زادے ہیں کہ شور و شر کی وجہ سے، اپنے برے کام کی وجہ سے باپ کے لیے عار ہیں؛ ہنرمند بھی اگر وہ حاسد ہے، اچھا نہ سمجھ، شیطان سے عبرت حاصل کر لے؛ اس کو علم حاصل تھا، اس کو چونکہ دین کا عشق نہ تھا، اس نے آدمؑ میں مٹی کی صورت کے علاوہ کچھ نہ دیکھا؛ اے امانتدار! اگرچہ تو علم کی باریکیاں جانتا ہے، اس سے

تیری غیب کو دیکھنے والی دونوں آنکھیں نہیں کھلتی ہیں؛ چونکہ وہ پگڑی اور داڑھی کے سوا نہیں دیکھتا ہے جاننے والے سے اس کی کمی بیشی پوچھتا ہے؛ اے عارف! تو بتانے والے سے بے نیاز ہے تو خود دیکھ لیتا ہے، کیونکہ تو چمکتا نور ہے؛ تقویٰ اور دین اور نیکی کام آتی ہے، کیونکہ اسی سے دونوں جہان میں نجات ہے؛ اس نے ایک نیک داماد پسند کرلیا، جو تمام خاندان اور قبیلہ کے لیے فخر تھا؛ تو عورتوں نے کہا اس کے پاس مال نہیں ہے سرداری اور مستقل ہونے کی خوبی نہیں ہے؛ اس نے کہا وہ چیزیں زہد اور دین کے تابع ہیں وہ روئے زمین پر بغیر سونے کا خزانہ ہے؛ جب واقعتاً لڑکی کا رشتہ مشہور ہوگیا چڑھاوا اور نشانی اور جوڑا (بھی)؛ آقا کا غلام جو گھر میں تھا، بہت جلد بیمار اور ضعیف اور کمزور ہوگیا؛ وہ دق کے بیمار کی طرح پگھلتا تھا اس کی بیماری کوئی طبیب نہ پہچانتا تھا؛ عقل کہتی تھی کہ اس کی بیماری دل کی ہے جسم کی دوا، دل کے غم میں بیکار ہے؛ اس بیچارے غلام نے اپنے حال کے بارے میں دم نہ مارا اگرچہ اس کے سینہ میں زخم لگ رہا تھا؛ ایک رات شوہر نے بیوی سے کہا کہ تو تنہائی میں اس سے اس کا حال دریافت کر؛ تو اس کی ماں کی بجائے ہے، (ہوسکتا ہے) کہ وہ اپنا غم تجھے ظاہر کردے؛ بیوی نے جب یہ بات کان میں ڈال لی وہ دوسرے دن غلام کے پاس گئی؛ وہ بیوی اس کے سر میں کنگھی کررہی تھی دوسو محبتوں اور ناز اور دوستی کے ساتھ؛ جیسا کہ مہربان مائیں، اس نے اس کو نرم کردیا یہاں تک وہ کہنے پر آ گیا؛ کہ مجھے آپ سے یہ امید نہ تھی کہ آپ لڑکی کو اجنبی، سرکش کو دیں گی؛ وہ میری آقا زادی ہے اور میں زخمی جگر ہوں (کیا) افسوس نہ ہوگا کہ وہ دوسری جگہ جائے؟ اس غصہ کی وجہ سے جو اس کو آیا، بیوی نے چاہا کہ اس کو پیٹے اور بالاخانہ سے نیچے گرادے؛ کہ وہ ہندی مادر بخطا کون ہوتا

ہے؟ کہ آقا کی لڑکی کا لالچ کرے؛ بولی صبر بہتر ہے، اپنے آپ کو قابو
میں کرلیا خواجہ سے کہا، کہ یہ عجب بات سن؛ ایسا کمینہ غلام خائن ہوگا ہم
نے گمان کیا کہ وہ بھروسہ کا ہے؛ اس نے اپنا حال مجھے اس طرح بتایا،
میں نے چاہا غصہ سے اس کو مار ڈالوں۔''[۶]

'کنار' کے معنی 'بغل، گوشہ، کسی چیز کا کنارہ، طرف' وغیرہ کے ہیں۔'اندام' یعنی 'بدن، جسم' اسی سے 'سیم اندام' ہے جس کا معنی 'چاندی جیسا جسم' کے ہے۔'گوہر' یعنی کسی چیز کی اصل، کسی چیز کی ذات، نسب، صفت، مخفی راز، موتی، جواہرات وغیرہ۔ مترجم نے 'خوش گوہر' کا ترجمہ 'خوش مزاج' سے کیا ہے۔'مراہق/مراہقہ' وہ لڑکا یا لڑکی جو بلوغت کے قریب پہنچے ہوں، بانفع ہونے کے قریب لڑکا یا لڑکی۔'کابین' یعنی مہر، نکاح کا پیسہ جو شوہر کے ذمہ واجب الادا ہوتا ہے۔'مہتر' یعنی 'بہت بڑا، بزرگ، اسی سے 'مہتر زادگی' آیا ہے یعنی 'رئیس زادہ ہونا۔'خواہش گر' خواہش مند، چاہنے والا۔'ننگ' عار، شرم۔'قماش' 'گھر کے مال واسباب، ریشمی کپڑے و جواہرات'۔'پیمان' کے معنی 'وعدہ، عہد، شہر' کے ہیں۔ اسی سے 'دست پیمان' آیا ہے جس کے معنی 'نقد یا جنس یا زیور جو خلوت کے وقت دلہن کو دیا جاتا ہے یعنی مہر معجّل۔'خشم' کے معنی 'غصہ، خفگی اور غضب' کے ہیں۔'ژاژ' کے معنی 'بیکار، بیہودہ' کے ہیں، 'ژاژی' یعنی 'بیہودگی' اور 'ژاژ خائی' یعنی بیہودہ گوئی۔'تار' کے معنی 'ڈورا، سوت، تانا، لوہے کا تار، تاریک اور تنگ' وغیرہ کے ہیں اور 'تار' 'تارک' کا مخفف بمعنی 'سر کے بالوں کا مانگ' بھی ہے۔'علت' یعنی 'مرض، سبب، وجہ'۔'زفت' (بفتح زاء) کے معنی 'سخت، فربہ اور موٹا' وغیرہ؛ 'زفت' (بضم زاء' کے معنی 'بدخو، بخیل اور بدمزہ' کے ہیں اور 'زفت' (بکسر زاء) بمعنی 'صنوبر کا گوند' کے ہے۔'ماکیان' یعنی 'گھر میں پلی ہوئی مرغی' اور 'خروس' یعنی 'گھر میں پلا ہوا مرغا'۔'انبان' کے معنی 'بوری، چمڑے کی تھیلی، فقیروں کی زنبیل' وغیرہ۔'انباد آرد' آٹے کی بوری۔'ختن' کے معنی 'داماد، ختنہ کرنا' وغیرہ ہیں۔'تتر' یعنی تاتار، اسی سے 'خاتون تتر' ہے یعنی 'تاتاری خاتون جو اپنے حسن و جمال میں مشہور ہوتی ہیں۔'نفیس' یعنی 'قیمتی چیز، کل شیء غالی الثمن. 'داماد' یعنی 'نیا دولہا' مجازاً بیٹی کا شوہر یعنی 'مردی که تازه ازدواج کرده است' تازہ داماد، جیسا کہ حافظ کہتے ہیں:

ای عروس هنر از بخت شکایت منمای

حجلۂ حسن بیارای کہ داماد آمد

'خیل' عربی کا لفظ جس کے معنی 'گھڑسواروں کا گروہ' مگر فارسی میں یہ مطلق گروہ کے معنی میں آتا ہے، خواہ وہ کسی بھی قبیل کا گروہ ہو آدمی، فرشتہ، جن، چرند و پرند وغیرہ۔ 'تبار' یعنی 'خاندان، نسل، اولاد' وغیرہ۔[۷]

قاضی سجاد حسین نے اشعار بالا کا اچھا ترجمہ کیا ہے مگر رعایت لفظی کی غایت پاسداری کے سبب مفہوم کی ترسیل میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ کہیں کہیں پر اشعار کا ترجمہ بالکل سپاٹ اور اٹ پٹا سا ہوگیا ہے، جس سے مفہوم میں پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر 'پروریدش از طفولیت بناز: درکنار لطف آن اکرام ساز' مترجم نے اس کا ترجمہ 'اس کو بچپن سے ناز سے پالا، اس کرم کرنے والے نے، مہربانی کے پہلو میں' جب کہ اگر اسے اس طرح کہا جاتا کہ 'اس کرم فرمانے مہربانی کے پہلو میں اسے بچپن سے ہی بڑے ناز و نعم سے پالا' تو زیادہ مناسب ہوتا اور مفہوم کی ادائیگی میں بھی حسن پیدا ہو جاتا۔

دوران ترجمہ کہیں کہیں تذکیر و تانیث کے تسامحات بھی در آئے ہیں، جیسے اسی کے اگلے شعر میں مترجم لکھتے ہیں 'اس آقا کے ایک لڑکی بھی تھی' جب کہ ترجمہ یوں ہونا چاہیے تھا کہ 'اس آقا کی ایک لڑکی تھی'۔

اسی طرح مولانا رومی کا یہ شعر 'عقل می گفتی کہ رنجش از دل ست: داروی تن در غم دل باطل ست' کا ترجمہ قاضی سجاد حسین نے اس طرح کیا ہے 'عقل کہتی تھی کہ اس کی بیماری دل کی ہے، جسم کی دوا دل کے غم میں بیکار ہے' جب کہ اس ترجمہ اگر یوں ہوتا کہ 'عقل کہتی تھی کہ اسے درد دل لاحق ہے، جسم کی دوا دل کے درد میں بیکار ہے۔' تو زیادہ بہتر ہو سکتا تھا۔

قاضی سجاد حسین نے مذکورہ بالا اشعار کا ترجمہ اچھا کیا ہے، ترجمے کی عبارت میں روانی اور شستگی پائی جاتی ہے اور مفہوم کی منتقلی میں بھی پورے طور پر کامیاب رہے ہیں۔ عبارت میں ادبیت کی چاشنی بھی دیکھنے کو ملتی ہے اور لفظ بہ لفظ ترجمہ ہونے کے باوجود بھی تخلیقیت کا رنگ جلوہ گر ہے۔ اس ترجمہ کو مترجم کے بہترین ترجموں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

ترجمہ کے حوالے سے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اگر متن کا لفظ پہلے سے ترجمے والی زبان میں

مستعمل ہوتو اس لفظ کا ترجمہ کرنا مناسب نہیں ہوتا، ایسے ہی غیر ضروری طور پر متن کے اصلی معنی کو ترک کر کے اس کے فرعی معنی یا دور کا معنی مراد لے لینا بھی اصول ترجمہ کے منافی ہے، جب کہ قاضی سجاد حسین کے ترجمہ میں اس طرح کی خامیاں بھی درآئی ہیں۔ مثال کے طور پر مثنوی کے پہلے دفتر کے پہلے ہی عنوان 'نی نامہ' کے اس شعر کو ملاحظہ کیا جائے:

من بھرج معیتی نالاں شدم

جفت خوشحالان و بدحالان شدم: ''میں ہر مجمع میں روئی خوش اوقات اور بداحوال لوگوں کے ساتھ رہی۔''[۸]

یہاں 'خوشحال' کے معنی 'آسودہ حال، کھاتا پیتا، مالدار یا جس کی گزر بسر خوب ہوتی ہو'، کے ہیں[۹] مگر 'خوشحال' کا لفظ اردو میں بھی خوب مستعمل ہے، اس کے باوجود مترجم نے اس کا ترجمہ 'خوش اوقات' کیا ہے اگر 'خوشحال' کا ترجمہ 'خوشحال' ہی کر دیتے تو مفہوم کی بہتر ترسیل ہوسکتی تھی۔ اسی طرح 'مثنوی معنوی' کے دفتر دوم میں 'مشورت کردن خدای تعالی با فرشتگان در ایجاد خلق' کے عنوان کے ذیل میں لائے گئے اشعار کا ترجمہ مترجم موصوف نے اس طرح کیا ہے:

مشورت می رفت در ایجاد خلق
جان شان در بحر قدرت تا بحلق
چون ملائك مانع آن می شدند
بر ملائك خفیه خنبك می زدند
مطلع بر نقش هرچه هست شد
پیش ازاں کیں نقش گل پابست شد
پیشتر زافلاك کیوان دیده اند
پیشتر از دانها ناں دیده اند

قاضی سجاد حسین کا ترجمہ:

''مخلوق کے پیدا کرنے میں مشورہ ہو رہا تھا، ان کی روح گلے گلے تک

قدرت کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی؛ جب فرشتے اس کے لیے مانع بنے، انھوں نے فرشتوں پر چپکے سے تالی پیٹی؛ وہ ہر اس چیز سے باخبر تھے جو وجود میں آئی، اس سے پہلے کہ یہ صورت مٹی کی پابند ہو؛ انھوں نے آسمانوں سے پہلے زحل کو دیکھا ہے، انھوں نے دانوں سے پہلے روٹی دیکھی ہے۔''[۱۰]

'مانع' یعنی رکاوٹ، آڑ، محافظ، روکنا، رکاوٹ بننا، خلاف، آڑے آنا؛ 'می رفت' یعنی می آمد؛ ایجاد یعنی آفرینش؛ 'تا بحلق' یعنی غریق؛ 'خنبک زدن'، تالی بجانا؛ 'نقش' سے مراد جسم؛ 'کیوان' یعنی زحل ستارہ جو اپنے بلندی میں مشہور ہے؛ 'پیشتر'، پہلے، قبل؛ 'بی دماغ'، بغیر دماغ کے؛ 'بی سپاہ' بغیر لشکر کے؛ 'گل' مٹی؛ 'پابست'، پابند۔[۱۱]

ترجمہ کے اصول میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ترجمہ کرتے وقت متن کی حتی المقدور رعایت کرنی چاہیے اور جب تک اس کے اصلی معنی میں تغیر وتبدل کی ضرورت نہ ہو خود سے مرادی معنی اخذ کرنا مناسب نہیں، جب کہ قاضی سجاد حسین نے یہاں 'تا بحلق' کا ترجمہ 'گلے گلے تک' کیا ہے، جب کہ حلق کا لفظ خود اردو میں بھی خوب مستعمل ہے اور 'گلا' بھی استعمال ہوتا ہے؛ 'حلق' کے معنی منھ کے بھی ہیں، لیکن مترجم نے 'تا بحلق' کا ترجمہ 'گلے گلے تک' مکرر لکھ کر مفہوم کو گنجلک کر دیا ہے، بادی النظر میں قاری چونک پڑتا ہے، اس لیے کہ اصل متن میں یہ لفظ مکرر مرقوم نہیں ہے۔[۱۲]

قاضی سجاد حسین کا ترجمہ کافی مختصر ہے، جس میں متن کی غایت رعایت موجود ہے۔ قاضی سجاد حسین کا ترجمہ جامع ہونے کے ساتھ عام فہم بھی ہے مگر کہیں کہیں علاقائی بولی کا لہجہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ کچھ مقامات پر ترجمے کی عبارت اتنی مختصر ہوگئی ہے کہ متن کے مافیہ کو کما حقہ واضح نہیں کر پاتی اور قاری کے لیے معمہ بن کر رہ جاتی ہے۔ دوران ترجمہ متن کے مروج الفاظ کا بھی ترجمہ کر دیا گیا ہے جو اصول ترجمہ کے مغایر ہے، کچھ اشعار کے ترجموں میں غیر موزوں اور غیر فصیح الفاظ کا بھی استعمال ہوا ہے جس سے ترجمہ کی عبارت بوجھل ہوگئی ہے اور مفہوم کی مکمل ترسیل نہیں ہو پائی ہے اور ابہامات کے مزید راستے ہموار ہو رہے ہیں۔ بہر حال اس طرح کی تسامحات کی حیثیت سمندر میں چند قطروں جیسی ہے۔

دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ قاضی سجاد حسین کا ترجمہ پچھلے کئی دہائیوں سے مختلف مطبوعات سے ہو بہو کتابت کے ساتھ شائع ہوتی رہی ہے۔ جب کہ ٹیکنالوجی کے اس دور میں جہاں ہر چیز میں ترقی ہوئی ہے اور لسانی فروغ کی راہیں بھی بہت حد تک ہموار ہوئی ہیں، وہیں ترجمہ کے لیے بھی کئی برقی آلات تیار ہو چکے ہیں۔ ایسے میں قاضی سجاد حسین کا ترجمہ اگرچہ جدید ترجموں کی فہرست میں شامل ہے، مگر پھر بھی اس پر کئی دہائیوں کے ادبی دور گزر چکے ہیں۔ اس لیے اسے اردو نثر کے قواعد و اصول اور رموز و اوقاف کی رعایت کرتے ہوئے از سر نو کتابت و طباعت کے مراحل سے گزارنے کی اشد ضرورت ہے۔ تبھی یہ ترجمہ آنے والی دہائیوں میں مزید مقبولیت کے پرچم لہرا سکے گی۔

کمیاں اور کوتائیاں اپنی جگہ، مگر اس بات سے انکار نہیں کہ قاضی سجاد کا ترجمہ عہد حاضر کے مقبول ترین ترجموں میں سے ایک ہے، یہ ترجمہ جہاں مختصر ہے وہیں آسان اور عام فہم بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی سجاد حسین کا 'ترجمۂ مثنوی معنوی' بہت ضخیم بھی نہیں ہے، ہر دفتر ایک عام کتاب کی ضخامت لیے ہوئے ہے اور طلبا، اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور اس فن کے ماہرین کے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہے۔ من جملہ طور پر قاضی سجاد حسین کا ترجمہ ''مثنوی معنوی'' کے موجودہ نثری تراجم کی فہرست میں اہم مقام رکھتی ہے اور اصول ترجمہ کے میزان پر بھی بہت حد تک کھرا اترتا ہے۔ یہ ترجمہ دور حاضر میں 'مثنوی معنوی' کے مقبول ترین تراجم کی فہرست میں شامل کیے جانے کے لائق ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ترجمہ مثنوی معنوی — قاضی سجاد حسین، مقدمہ دفتر سوم، صفحات: ۳ تا ۷۴

۲۔ ایضاً، دفتر سوم، صفحات: ۸۱ تا ۸۲

۳۔ ایضاً، دفتر سوم، صفحات: ۱۰۵ تا ۱۰۶

۴۔ ایضاً، دفتر سوم، صفحات: ۱۲۸ تا ۱۲۹

۵۔ ایضاً، دفتر چہارم، صفحات ۲۱۷ تا ۲۱۹

۶۔ ایضاً، دفتر ششم، صفحات: ۳۸ تا ۴۱

۷۔ لغات کشوری — مولوی تصدق حسین، دارالاشاعت اردو بازار، کراچی (پاکستان)

۸۔ ترجمہ مثنوی معنوی — قاضی سجاد حسین، دفتر اول، ص: ۳۱

۹۔ فیروز اللغات — مولوی فیروز الدین، ص:۴۴۳
۱۰۔ ترجمہ مثنوی معنوی — قاضی سجاد حسین، دفتر دوم، ص:۳۰ تا ۳۱
۱۱۔ القاموس الجدید (عربی اردو) وحید الزماں کیرانوی، ص:۸٦۵ تا ۸٦٦
۱۲۔ درسی اردو لغت — محمد اسحٰق جلال پوری، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص:۵٦۵

انیس الرحمن قاسمی *

صوبۂ بہار کا جغرافیائی و تاریخی پس منظر

یہ امر تو مسلم ہے کہ جغرافیائی یا طبعی حالات پر انسان کی نشو ونما کا دارومدار ہے، انسانی تفکرات، فہم ودانش اور معیشت واقتصادیات کا انحصار بھی طبعی ماحول پر مرتب ہوتا ہے۔تہذیبوں کا مطالعہ کرنے سے قبل ہمیں اس خطہ کے قدرتی ساخت پر توجہ ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے، طبعی حالات کی بناء پر اپنے عہد کی تاریخیں مرتب کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

صوبۂ بہار (متحدہ [1]) ہندوستان کے اس خطہ کا نام ہے جو صوبۂ اتر پردیش اور صوبۂ بنگال کے درمیان واقع ہے۔جغرافیائی لحاظ سے بہار کے زمینی علاقے کو دریائے گنگا دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اس جغرافیائی تقسیم سے دونوں کی دو درخشاں تاریخیں مرتب ہوئی ہیں۔قدیم تاریخ میں گنگا کے شمالی حصے کو متھلا دیس اور جنوبی حصے کو مگدھ دیس کہا جاتا تھا۔ مگدھ دیس میں پٹنہ، گیا، راجگیر ، بہار شریف، نوادہ، نالندہ، باڑھ، آرہ، مونگیر بھاگلپور وغیرہ کے علاقے شامل ہیں۔مگدھ سے مراد صوبہ بہار ہے۔ بہار کا قدیم نام مگدھ تھا جو بعد میں موجودہ گیا کے لیے مخصوص ہوکر رہ گیا۔

☆ گیسٹ فیکلٹی شعبہء اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵ ای میل: anisurrahmanqasmi@gmail.com

پاٹلی پتر (پٹنہ) اور مگدھ کی دلچسپ سرگزشت کو میگاستھنز نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''انڈیکا'' (۳۰۰ سال قبل مسیح) میں اور چینی بدھ زائرین فاہیان اور ہون سانگ (چوتھی، پانچویں صدی عیسوی اور ساتویں صدی عیسوی) نے اپنے مشہور زمانہ سفرناموں میں قلم بند کیا ہے۔

میگاستھنز لکھتا ہے کہ ''پاٹلی پتر'' نو میل چوڑا اور ڈیڑھ میل لمبا تھا، اس کے گرد لکڑی کی مضبوط فصیل تھی جس میں چونسٹھ دروازے تھے اور اس کے اوپر پانچ سو برج تھے۔ فصیل کے باہر ایک وسیع اور عمیق خندق تھی جس میں دریائے سون کا پانی بھرا ہوا تھا۔ شہر کے اندر بادشاہ (چندر گپت موریا) کا محل تھا جو لکڑیوں کا بنا ہوا تھا اور بہت عالی شان تھا۔ اس کے ستونوں اور دیواروں پر سونے کا پانی بھرا ہوا تھا اور ان پر سونے کی بیلیں اور چاندی کے پرندے منقوش تھے۔ تمام عمارتیں ایک وسیع میدان میں تھیں۔ جس میں مچھلی کے تالاب اور انواع واقسام کے نمائشی درخت اور بیلیں لگائی گئی تھیں۔

رام گوپال سنگھ چودھری نے اپنی کتاب Ramble of Bihar میں ان خاندانوں کی فہرست مرتب کی ہے جنہوں نے مگدھ پر پانچ ہزار سال تک حکومت کی۔

متھلا دیس جس کو اب ترہت کے نام سے جانا جاتا ہے مظفر پور، ویشالی، دربھنگہ، سیتامڑھی، سمستی پور، سیوان، سپول، مشرقی چمپارن اور مغربی چمپارن وغیرہ کے علاقوں پر مشتمل ہے۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ان دونوں حصوں کو ملا کر صوبۂ بہار کا نام دیا گیا تھا۔

اگر مسلم حکمرانوں کی بات کی جائے تو تاریخی حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ سب سے پہلے دہلی کے سلطان غیاث الدین محمد تغلق نے ۱۳۲۴ء میں بنگال کی بغاوت کو کچلنے کے بعد دہلی کو لوٹتے ہوئے ترہت پر پیش قدمی کی تھی، وہاں کے راجا ہرسمہا نے حملہ کی تاب نہ لاکر راہ فرار اختیار کی، تغلق نے حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد حکومت کی باگ ڈور کامیشور کو سونپ دیا جو Oniwar خاندان کا بانی تھا، اور یہاں اپنے ایک نائب کو چھوڑ کر دہلی کو واپس ہوا۔

غیاث الدین تغلق کی ترہت پر پیش قدمی سے متعلق محمد سعید الحق لکھتے ہیں:

> ''جونا خاں (محمد تغلق) کو نائب السلطنت بنا کر اس نے دہلی میں چھوڑا اور خود ۱۳۲۴ء میں بنگال کے باغی غیاث الدین بہادر کو شکست دے کر اس کے بھائی ناصر الدین کو بنگال کا گورنر بنایا نیز اس کا الحاق سلطنت دہلی کے

ساتھ کرلیا، واپسی میں ترہت کا مضبوط قلعہ فتح کرلیا۔'' [۲]

ممتاز مؤرخین پروفیسر محمد حبیب و پروفیسر خلیق احمد نظامی، سلطان غیاث الدین تغلق (عہد حکومت ۲۵-۱۳۲۰ء) کے حالات میں لکھتے ہیں:

''بنگال سے واپسی کے موقع پر سلطان نے ترہت پر حملہ کیا، عصامی لکھتا ہے کہ رائے جنگلوں میں بھاگ گیا لیکن شاہی فوجوں نے اس کا تعاقب تیزی کے ساتھ کیا، لیکن وہ راستہ کھو بیٹھیں اور اس کو بہت سے درختوں کو کاٹنا پڑا، بڑی مشکل سے حملہ آور ایک قلعہ کے نزدیک پہونچے مگر یہ بہت مضبوط تھا اور اس پر قبضہ نہیں کیا جاسکتا تھا، ملحقہ زمین تاراج کردی گئی اور بہت سے آدمی مارے گئے، غیاث الدین نے ترہت کو ہل تلبغہ کے بیٹے احمد خان کے ذمہ لگایا اور دارالسلطنت کی جانب اپنے واپسی سفر پر روانہ ہوا۔'' [۳]

قدیم سرزمین بہار پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو بنارس سے لے کر موجودہ آسام تک کا علاقہ بہار میں شامل تھا، اس علاقے کی تاریخ بہت قدیم ہے، اس نے متعدد اور زبردست قوموں کے عروج وزوال دیکھے، یہاں کی سرزمین میں چندر گپت موریا، اشوک سمراٹ، ہرش، پال اور دوسرے متعدد بادشاہوں نے حکومت کی۔ مذہبی اعتبار سے بدھ مذہب اور جین مذہب کا ارتقا یہیں سے ہوا اور پوری دنیا میں پھیلا، علمی اعتبار سے بھی یہ علاقہ نہایت زرخیز رہا ہے، دنیا کی سب سے قدیم یونیورسٹی (نالندہ یونیورسٹی موجودہ شہر بہار شریف کے قریب) واقع تھی۔ ریاست بہار روز اول سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے یہاں کے علم وفن اور درسگاہوں کی اہمیت وافادیت کا اعتراف نہ صرف قومی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر کیا جاتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک ذی علم ہستیاں پیدا ہوتی رہیں، جنہوں نے نہ صرف اپنے صوبۂ بہار کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی میدان میں بلکہ ملک وقوم کی تعمیر وترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔

یہاں قدیم دور میں نالندہ یونیورسٹی کے علاوہ مزید تین مہتم بالشان تعلیمی ادارے قائم ہوئے تھے جس نے پوری دنیا میں علم کی روشنی پھیلائی، وکرم شیلا بھاگلپور میں قصبہ پہل گاؤں کے قریب، جراسن

جو گیا کے علاقے میں قائم ہوا تھا، اودیان بہار شریف کے قریب اودنڈ پور میں واقع تھا۔

یہ عہد قدیم سے گوناگوں خصوصیت کا حامل ہے یہی وہ سرزمین ہے جہاں بڑے بڑے دانشور، مصلح، مفکر، ارباب فکر وفن اور صاحب سیف وقلم پیدا ہوئے جنہوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں قابل قدر خدمات انجام دیئے۔ گوتم بدھ، مہاویر جین، مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری، مظفر شمس بلخی جیسا مصلح، چانکیہ، جنک جا گیولک جیسا مفکر، شیر شاہ سوری جیسا بادشاہ، بیدل راسخ اور شاد جیسا شاعر ہندوستان کے دوسرے خطوں نے بہت کم پیدا کئے۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد (اول صدر جمہوریہ ہند) نے اپنے پیغام میں بہار کی عظمت پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی ہے:

> ''بہار'' جنک، یکنا، والکیہ اور گوتم کی سرزمین ہے، یہ مہاویر، بدھ، چندر گپت، چانکیہ، اشوک اور گپت خاندانوں کے راجاؤں کی بھی سرزمین ہے۔ ویدھ، مگدھ اور الگا جدید بہار کے قدیم نام ہیں۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ صدیوں تک ہندوستان کی تاریخ بہار کی تاریخ رہی ہے۔'' [۴]

بہار کا قدیم نام مگدھ تھا لیکن اس کا نام بہار کیوں ہوا اور کیسے ہوا اس تحریر سے وضاحت ہوجاتی ہے۔

> ''بہار لفظ وہارا کی ایک مروجہ شکل ہے اور وہارا بودھ مت کے علمی وعملی مرکزوں کی تعبیر تھی، اپنے ان ہی وہاروں کی وجہ سے، جن کا جال اس صوبہ کے طول وعرض میں پھیلا ہوا تھا، اس پورے علاقہ کا نام بہار ہوگیا۔'' [۵]

واضح رہے کہ صوبۂ بہار میں ''بہار شریف'' ایک شہر بھی ہے جو بختیار پور سے جنوب اور راجگیر سے شمال جانب تقریباً ان دونوں کے درمیان میں واقع ہے۔ یہ ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ قاضی منہاج السراج کے مطابق ۱۲۰۳ء میں بختیار نے بہار شریف پر قبضہ کیا تھا۔ یہ مسلم عہد حکومت میں صوبۂ بہار کا پہلا دارالسلطنت تھا۔ فاتح بہار محمد بن بختیار خلجی سے لے کر شیر شاہ سوری تک اسے صوبہ کے

دارالسلطنت کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہ وہ شہر ہے جہاں بختیار خلجی کے مزار کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے۔

موجودہ صوبۂ بہار قرون وسطیٰ میں ایک سیاسی اکائی نہیں تھی۔ گنگا صوبۂ بہار کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی، شمالی اور جنوبی اور یہ اس علاقہ کی سیاسی حد بندی تھی، شمالی اور جنوبی بہار کے ان دو وسیع علاقوں کے اندر بھی چھوٹے چھوٹے قطعات تھے، جو مقامی حکمرانوں کے زیر نگیں تھے۔ شمالی بہار ایک وسیع خطہ تھا اور ۱۰۹۷ء کے دوران کرنا تا خاندان اس علاقہ کے حکمراں تھے جس کا بانی نینا دیوا تھا۔ متھلا کی حکومت کے شمال میں کوہ ہمالیہ تھا جب کہ جنوب مغرب اور مشرقی اطراف میں دریائے گنگا، گنڈک اور کوسی تھا۔ شمالی بہار چھ اضلاع پر مشتمل تھا جبکہ جنوبی بہار کے مختلف حصوں پر گہنا والا اور پال خاندانوں کے افراد حکومت کر رہے تھے۔

> ''بہار میں شاہ آباد پٹنہ اور منگھیار (مونگیر) کے علاقے پہلے گوند کا ندرا گاندھ والا اور بعد میں مدن بالا کے زیر حکومت رہے جب کہ مشرقی بہار سینا حکمرانوں کے زیر نگیں تھا۔'' [۶]

ریاست بہار پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ بارہویں صدی ہجری کے اواخر میں مسلمانوں کا وجود یہاں نظر آتا ہے اور بالترتیب تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے اور پھر تقسیم ہند تک یہاں کی غالب اکثریت مسلمان نظر آتی ہے جن کی دینی، سماجی، سیاسی، معاشرتی، تعلیمی، ادبی، لسانی اور معاشی غرض ہر سطح پر اپنے فکر و عمل سے فوقیت رہی ہے۔ آج بھی مختلف لائبریریوں، درسگاہوں اور خانقاہوں میں ان کے تاریخ ساز کارناموں کو بیان کرنے والے دستاویزات موجود ہیں۔

مسلم عہد حکومت کے دوران اس خطے میں سلاطین دہلی، سلاطین شرق اور بنگال کے حکمرانوں کے مابین برسوں کشمکش جاری رہی۔ ہر ایک کے عہد میں اس کے حدود میں تبدیلیاں آتی رہیں، مغلیہ دور سے قبل کے جغرافیائی حدود کا صاف طور پر پتہ نہیں ملتا ہے۔ لیکن مغلیہ نقشوں کی مدد سے علاقائی حد بندیوں کا اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے۔

چودھویں صدی کا ابتدائی نصف بہار کے سیاسی جغرافیہ کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں شمالی بہار میں تغلق خاندان کی مضبوط حکومت، بنگال کے الیاس شاہ کی تیزی سے

کامیابی اور عروج اور آخر کار فیروز شاہ تغلق کے ہاتھوں بہار سے بنگالی اقتدار کے خاتمہ سے ملتا ہے۔

فارسی زبان میں لکھی گئی تاریخ کی کتابوں میں غیاث الدین تغلق (۲۵-۱۳۲۰ء) کے ترہت پر آخری حملہ ۱۳۲۴ء کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں ہریش مہادیوا نے شمالی پہاڑیوں (نیپال ترائی) کی طرف کوچ کیا اور ترہت دہلی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ اس سے قبل ترہت کے علاقے سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا مگر وہ باقاعدہ دہلی سلطنت میں شامل نہیں تھا۔

اکبر نے بہار کو ۱۵۷۶ء میں فتح کیا۔ اس کے بعد جب اس نے اپنی سلطنت کے نظم ونسق کو منظّم کیا اور اسے صوبوں میں تقسیم کیا تو بہار کو ۱۵۸۰ء میں ایک صوبہ بنا دیا گیا، آئین میں صوبے کی سرحدیں بیان کی گئی ہیں جو اس طرح ہیں:

> ''اس کی لمبائی غازی پور سے رہتاس ۱۲۰ کوس، چوڑائی (پھیلاؤ) ترہت سے شمالی پہاڑوں تک ۱۱۰ کوس، اس کی مشرقی سرحد پر بنگال ہے، مغرب میں الہٰ آباد اور اودھ ہیں، شمال اور جنوب میں اونچی پہاڑیاں واقع ہیں۔''[۷]

یہ دو وسیع وعریض خطے پر پھیلا ہوا تھا، ایک گنگا کا درمیانی حصہ جبکہ دوسرا چھوٹا ناگپور کا علاقہ کہلاتا تھا۔

صوبہ آٹھ سرکاروں پر منقسم تھا اور ہر سرکار مزید کئی پرگنوں میں بٹی ہوئی تھی، اس طرح سے کل ۱۹۹ پرگنائیں تھیں۔

(۱) سرکار بہار چھیالیس پرگنوں (پٹنہ، گیا، نوادہ وغیرہ) پر مشتمل تھا۔
(۲) سرکار منگھیار (مونگیر) میں اکتیس
(۳) سرکار چمپارن میں تین
(۴) سرکار حاجی پور میں گیارہ
(۵) سرکار سارن میں سترہ
(۶) سرکار ترہت میں چوہتر
(۷) سرکار کوکھرا، اس میں سات پرگنے رانچی، دھنباد، سنگھ بھوم وغیرہ شامل تھے۔

(۸) سرکار رہتاس میں اٹھارہ پرگنے شامل تھے، بعد میں روہتاس کی سرکار دوحصوں میں تقسیم ہوگئی، روہتاس اور بھوجپور یا شاہ آباد۔اس طرح سرکاروں کی تعداد نو ہوگئی۔

غیر منقسم روہتاس سرکار کی اٹھارہ پرگناؤں میں سے سات روہتاس میں رہیں اور گیارہ بھوجپور یا شاہ آباد میں چلی گئیں۔یہ پرگنہ اس لیے بنائی گئی تھیں تا کہ نظم ونسق اور ٹیکس کی وصولی میں سہولت ہو، مغلیہ دور سے انگریزی حکومت کے ابتدائی ادوار تک یہ پرگنے قائم تھے۔

عہد اکبری میں صوبہ کے یہ نو سرکاریں ایک حاکم کے ماتحت رہتا تھا مگر انگریزی عملداری میں وہ سرکاریں ذیل کے ناموں کے ساتھ مسمی ہیں، جو ایک کمشنر کے ماتحت ہوتا تھا، جس کا صدر مقام شہر پٹنہ تھا، ان سب ضلعوں میں ایک ایک جج اور کلکٹر اور مجسٹریٹ کام کرتے تھے

(۱) ضلع شاہ آباد جس میں سہسرام اور بکسر اور جگدیش پور وغیرہ شامل تھے

(۲) ضلع پٹنہ جس میں باڑھ وقصبۂ بہار شامل تھے، صدر مقام پٹنہ عظیم آباد تھا

(۳) ضلع گیا جس میں نوادہ، اورنگ آباد اور جہان آباد شامل تھے

(۴) ضلع ترہت، صدر مقام مظفر پور اور دربھنگہ

(۵) ضلع سارن جس میں علی گنج سیوان بھی شامل تھے

(۶) ضلع چمپارن صدر مقام موتیہاری

(۷) ضلع رانچی

اسی طرح برطانوی حکومت نے اپنے ابتدائی دور حکومت میں پرگنہ کی انتظامی اکائیاں ختم کر کے ان کی جگہ محاصل جمع کرنے کے لیے تھانوں کا نظام رائج کیا۔پرگنہ کے وہ نقشے جو برطانوی حکومت نے ابتدائی دور میں تیار کروائے تھے۔اس سے ان ذیلی علاقوں کی فہرست بھی ملتی ہے جو مغلیہ دور میں تھے۔

بہار کی سرحدی حد بندی پر تبصرہ کرتے ہوئے فصیح الدین بلخی لکھتے ہیں:

> صوبۂ بہار نے کئی نشیب وفراز دیکھے، کبھی وہ بنگال کے ساتھ شامل رہا تو کبھی اڑیسہ کے ساتھ الحاق کر دیا گیا۔۱۷۶۵ء سے بنگال کے حاکم کے تحت رہا۔۱۹۱۲ء میں بہار اور اڑیسہ کو بنگال سے جدا کر کے دوصوبوں میں

تقسیم کر دیا گیا اور بہار کا انتظامی حیثیت سے اڑیسہ کے ساتھ الحاق کر دیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں بہار اور اڑیسہ کو دو علیحدہ صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا (۱۹۳۶ء تک اڑیسہ بھی بہار میں شامل تھا)۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہو گیا تو صوبۂ بہار بھی ایک الگ مستقل صوبہ بن گیا۔'' [۸]

صوبہ کی حدود اربعہ، رقبہ اور آبادی

صوبۂ بہار ملک کے مشرق حصہ میں واقع ہے، اس کے مشرقی جانب اتر پردیش، مغربی جانب بنگال، اس کے شمال میں نیپال جب کہ اڑیسہ اس کے جنوب میں واقع ہے۔

اس کا کل رقبہ ۱۹۴۹۶۰۱۴ اسکوائر کیلومیٹر ہے اور اس کے تمام علاقوں میں مسلم آبادی کم وبیش موجود ہے۔ جیسا کہ میں نے ماقبل میں بیان کیا کہ موجودہ بہار دو حصوں پر مشتمل ہے، جنوبی اور شمالی۔ جنوب کے علاقے میں پٹنہ، گیا، نوادہ، نالندہ، مونگیر، جہان آباد، جموئی، شیخ پورہ، اورنگ آباد، ارول وغیرہ شامل ہیں جبکہ شمالی حصے میں سیوان، دربھنگہ، مظفر پور، کھگڑیا، چمپارن، سیتامڑھی، سمستی پور وغیرہ کے علاقے شامل ہیں۔

صوبہ کی موجودہ مجموعی آبادی ۲۰۱۱ کی مردم شماری کے مطابق ۸۶۰۷۸۶۸۶ ہے جبکہ مسلمانوں کی تعداد تقریب ۱۷۵۵۷۸۰۹ ہے۔[۹] واضح ہو کہ یہاں مسلمانوں کی تعداد ہندو اکثریت کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔

تقسیم ہند سے قبل بہار میں مسلمانوں کی آبادی موجودہ آبادی سے زیادہ تھی، لیکن تقسیم کے وقت تقریبا ۳۰ لاکھ مسلم پاکستان اور بنگلہ دیش چلے گئے۔

صوبۂ بہار کی ندیاں

قدرتی ساخت کے لحاظ سے یہ صوبہ دو حصوں میں منقسم ہے، ایک شمالی اور دوسرا جنوبی، اور دونوں اپنے طبعی حالات، آب وہوا، پیداوار، نسل اور زبان کے لحاظ سے قطعی مختلف ہیں۔

اس صوبہ کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں بے شمار ندیاں ہیں۔ گنگا، گنڈک، پرسائی، سون،

پھلگو، پن پن، کوسی، دھنر جے، کرم ناسا، وردھا، مورہر، شمالی کوئل، جنوبی کوئل، دامودر، سورن ریکھا، براکر، سنکھ جیسی مشہور ندیاں اسی صوبہ میں بہتی ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بے شمار ندیاں ہیں، گنگا بنارس کی طرف بہتے ہوئے بنگال کا رخ کر لیتی ہے، گنڈک شمال مغرب سے بہہ کر حاجی پور میں آ کر گنگا سے مل جاتی ہے، سون ندی روہتاس گڑھ سے بہہ کر گیا، شاہ آباد ہوتے ہوئے پٹنہ سے تقریباً ۳۵ کیلومیٹر مغرب منیر میں گنگا سے جا ملتی ہے۔ گنڈک کے کنارے چھپرہ ضلع سارن بسا ہوا ہے، پھلگو گیا شہر کے وسط سے بہتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ یہ ندی ہندوؤں کے یہاں مقدس شمار کی جاتی ہے۔ دھنر جے ندی نوادہ شہر سے دس کیلومیٹر دور باب نور (بھنور) کے وسط سے نکلتی ہے، پن پن بھی ایک چھوٹی سی ندی ہے جو پٹنہ سے تقریباً ۱۰ کیلومیٹر جنوب میں بہہ کر آتی ہے۔ اس کے علاوہ گھاگھرا، گوگری، باگ متی بھی بہار کی ندیاں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان ندیوں سے کاشت کاری میں مدد لی جاتی ہے اور زراعت کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔

آب وہوا

سمندر سے قدرے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے اس کی آب وہوا بنگال کی نسبت غیر معتدل ہے، یعنی موسم سرما میں سخت سردی اور موسم گرما میں یہاں کے باشندوں کو سخت گرمی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بارش بھی بنگال کے مقابلے کمتر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شمالی بہار میں آئے دن خشک سالی اور مصائب کا سامنا رہتا ہے لیکن جنوبی بہار میں اتنے قحط نہیں پڑتے۔ بارش کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ جنوب مغرب سے چلنے والی ہوا کی بارش زیادہ تر آسام اور بنگال میں برس جاتی ہے اور صرف وہ جھونکے بہار تک پہنچتے ہیں جن کا رخ ہمالیہ کے سامنے حائل ہونے کے باعث مغربی علاقے کی طرف پھر جاتا ہے۔

بہار میں سال کو موسم کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ موسم گرما، موسم سرما، موسم باراں۔ دسمبر سے سردیوں کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ دسمبر اور جنوری میں کڑاکے کی سردی پڑتی ہے۔ مارچ سے موسم گرما کی آمد ہوتی ہے اور مئی میں بڑی شدت کی گرمی پڑتی ہے۔ جبکہ جون سے موسم باراں شروع ہو جاتی ہے۔

پانی کی اہمیت کائنات کے وجود کے لیے مسلم ہے یہی وجہ ہے کہ موسم باراں میں یہاں کے عوام اور خاص طور پر کسان طبقہ بارش کا انتظار بڑی شدت سے کرتا ہے اور بڑی مسرت کے ساتھ اس کا استقبال کرتا ہے، چونکہ بہار کا اکثر علاقہ کاشت کاری پر مبنی ہے اور بارش کے بغیر یہ مشکل امر ہے۔ جس سال بارش کم ہوتی ہے تو پیداوار کا گراف گر جاتا ہے۔ مجموعی اعتبار سے بارش یہاں اچھی ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ خطہ بڑا شاداب اور زرخیز ہے لیکن اب چند سالوں سے یہاں بارش کم ہوتی ہے۔ بعض علاقوں میں پہاڑ کثرت سے پائے جاتے ہیں اور بے شمار ندیاں بہتی ہیں۔ گویا یہاں نشیبی اور پہاڑی دونوں علاقے پائے جاتے ہیں۔

معدنیات

معدنی دولت کی وجہ سے بہار برصغیر کا سب سے دولت مند صوبہ ہے، اس علاقے میں جتنی معدنی دولت دستیاب ہے دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہاں قیمتی دھاتیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔[۱۰]

زیادہ تر کوئلہ بہار اور بنگال سے نکالا جاتا ہے۔ بہار کے اضلاع جھریا، دھنبا داور گریڈیہہ (اب یہ اضلاع جھارکھنڈ میں ہیں) سے کوئلہ نکالا جاتا ہے۔ اسی طرح لوہے کا کافی ذخیرہ یہاں موجود ہے۔ ہندوستان کے تمام ذخائر کا ۹۵ فی صد ذخیرہ بہار اور اڑیسہ میں ہے۔

لوہا، (جمشید پور کے نزدیک چھوٹا ناگپور میں حاصل ہوتا ہے) المونیم، کوئلہ، میگنیز، (یہ دھات ہلکا خاکستری رنگ کا ہوتا ہے یعنی سفید اور سیاہی مائل۔ یہ دھات بہت ہی کارآمد ہے۔ شیشہ بنانے کے کام میں استعمال ہوتی ہے) یورنیم، ٹن، کرم فولا، میکا، خام المونیم جیسے دھات وافر مقدار میں یہاں کی زمین میں دفن ہیں۔

جدید دنیا ابرق کو ایک اہم معدنیات میں شمار کرتی ہے۔ ساری دنیا میں جتنا ابرق دستیاب ہوتا ہے اس سے کئی گنا صرف بہار سے حاصل ہوتا ہے۔ گیا کی سرحد سے لے کر ہزاری باغ اور جھاجھا تک ابرق کا طویل سلسلہ ہے۔ سب سے بڑی ابرق کی کان بلکہ ابرق کا مرکز کوڈرما ہے جو کہ ہزاری باغ (اب یہ اضلاع جھارکھنڈ میں ہیں) ضلع میں واقع ہے، بہار میں سرخ رنگ کا ابرق پایا جاتا ہے اس

کو Roby Mica کہتے ہیں۔

کرم فولا Chromite تانبا، خام المونیم، چونے کے پہاڑ، شورہ، مینگنیز شیشہ بنانے والا دھات، کثیر مقدار میں پایا جاتا ہے، جب کہ قلیل مقدار میں سونا بھی پایا جاتا ہے۔

صنعت وحرفت

جمشید پور میں لوہے اور کھانڈ بنانے کے کارخانے، کوڈرما میں ابرق اور تانبے کے مشہور کارخانے، رہتاس اور ڈہری اون سون میں چونے اور سیمنٹ کے کارخانے اور مؤخر الذکر شہر میں شکر کے کارخانے، گیا میں جوٹ کے کارخانے اسی طرح شہر بھاگلپور میں سلک اور سوتی کپڑوں کے کارخانے بہت مشہور ہیں۔

زراعت وکاشت کاری

صوبہ کی زیر کاشت اراضی میں تقریباً بیس فی صد سے دوہری فصلیں حاصل کی جاتی ہیں۔ بہار کے مختلف علاقوں میں مختلف فصلیں ہوتی ہیں۔ چاول، گیہوں، مکئی، چنا، مسور، ارہر، مٹر، جوار، گنا، روغنی تخم سرسوں، تیسی، تل وغیرہ، تقریباً ہر طرح کی فصل پیدا ہوتی ہے۔ شاہ آباد (چھپرہ) کا گیہوں عمدہ ہوتا ہے، گنا بھی چند دہائی قبل تک بکثرت پیدا ہوتا تھا لیکن اب کم ہوتا ہے۔ چاول کے کئی اقسام یہاں کی پیداوار ہیں، جبکہ بعض علاقوں میں مکھانا، مونگ پھلی اور جوٹ بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اتر پردیش کے بعد بہار سفید شکر پیدا کرنے والا سب سے بڑا صوبہ ہے۔ ۱۹۶۰ء کی ابتدائی دہائی میں ملکی شکر کی مجموعی پیداوار کا ایک چوتھائی صرف بہار فراہم کرتا تھا۔ صوبہ میں تمباکو کی کاشت میں اس وقت اضافہ شروع ہوا جب Penisula tobacco company نے دنیا کے سب سے بڑے سگریٹ سازی کے کارخانوں میں شمار ہونے والا ایک کارخانہ مونگیر میں لگایا تھا۔

پھلوں میں آم، امرود، لیچی اور کیلے وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ بھاگلپور، پٹنہ اور ترہت کے آم بہت مشہور ہیں۔ مظفر پور کی لیچی پوری دنیا میں مشہور ہے۔ کیلا، شریفہ، امرود، نارنگی، خربوزے، تربوز، غرض سب طرح کے پھل کھانے کے قابل پیدا ہوتے ہیں۔

مولانا عبدالحی حسنیؒ نے صوبہ بہار کو ''بَہار'' ب کے زبر کے ساتھ لکھا ہے یعنی پر کیف جگہ۔ وہ اس صوبہ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''یہ زرخیز خطہ ہے جہاں چاول، گنا، کیلے، آم اور پان کی پیداوار ہوتی ہے'' اور پھر یہاں کی ندیوں اور شہروں کے بارے میں مختصراً ذکر کرتے ہیں۔[۱۱]

زبانیں

بہار ایک کثیر لسانی صوبہ ہے۔ اس کے مشرقی حصے میں میتھلی، ترہتی اور مگدھی زبانیں بولی جاتی ہیں جبکہ اس کے مغربی حصے میں بھوجپوری زبان بولی جاتی ہے۔

موجودہ دور میں ہندی اور اردو کے علاوہ دوسری مقامی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں، جیسے سنتھالی، ہو، مندری، کوڈک، ناگپوری، صدری، کرمالی، بنگالی اور اڑیا۔ انتظامی کاروبار اور تعلیم کی زبان ہندی، انگلش اور اردو ہے۔

بہار میں ہر قسم کے جانور پرورش پاتے ہیں بالخصوص گائے، بھینس، بیل، بکری وغیرہ کثرت سے پائے اور پالے جاتے ہیں جبکہ بعض لوگ گھوڑے، گدھے اور دوسرے جانوروں کی پرورش بھی کرتے ہیں۔

باشندوں کے اطوار و عادات

فصیح الدین بلخی اس صوبہ کے باشندوں کی عادتیں بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس صوبہ کی خلقت خوش خلق، غریب نواز مگر عیش دوست ہے۔ اسی سبب سے پرانے خاندان مفلس اور قرض دار اور بے معاش ہو گئے۔''[۱۲]

صوبۂ بہار (متحدہ) کے ۱۴ ڈویژنوں کے نام

ڈویژن	صدر مقام	اضلاع
۱۔ پٹنہ	پٹنہ	پٹنہ، بھوجپور، بھبھوا، روہتاس، بکسر اور نالندہ

۲۔مگدھ	گیا	گیا،نوادہ، جہان آباد،ارول اوراورنگ آباد
۳۔ترہت	مظفر پور	مظفر پور،مشرقی چمپارن،مغربی چمپارن،سیتامڑھی، ویشالی اورشیوہر
۴۔سارن	چھپرہ	سارن،سیوان اور گوپال گنج
۵۔بھاگلپور	بھاگلپور	بھاگل پوراور بانکا
۶۔مونگیر	مونگیر	مونگیر، بیگوسرائے،کھگڑیا،لکھی سرائے،شیخ پورہ اور جموئی
۷۔پورنیہ	پورنیہ	پورنیہ،کٹیہار،اراریہ اورکشن گنج
۸۔دربھنگہ	دربھنگہ	دربھنگہ،مدھوبنی اورسمستی پور
۹۔کوسی	سہرسہ	سہرسہ،مدھے پورہ اورسپول
۱۰۔پلاموں	میدنی نگر	پلاموں،گڑھواورلاتیہار
۱۱۔شمالی چھوٹاناگپور	ہزاری باغ	چترا،ہزاری باغ،کوڈرما،گریڈیہہ،رام گڑھ،بوکارو اوردھنباد
۱۲۔جنوبی چھوٹاناگپور	رانچی	لوہارڈاگا،گملا،سمڈیگا،رانچی اورکھونٹی
۱۳۔کولہن	چائے باسا	مشرقی سنگھ بھوم،مغربی سنگھ بھوم،سرائے کھرساون
۱۴۔سنتھال پرگنہ	دمکا	جام تاڑا،دیوگھر،دمکا،پاکوڑ،گڈااورصاحب گنج

صوبۂ بہار کے اضلاع

(۱) اراریہ (۲)ارول (۳)اورنگ آباد (۴)بانکا (۵)بیگوسرائے (۶) کیمور (بھبھوا) (۷) بھاگلپور (۸) بھوجپور (۹) بکسر (۱۰) پٹنہ (۱۱) پورنیہ (۱۲) جموئی (۱۳) جہان آباد (۱۴) دربھنگہ (۱۵) روہتاس (۱۶) سہرسہ (۱۷) سمستی پور (۱۸) سارن (۱۹) سیتامڑھی (۲۰) سیوان (۲۱) سپول (۲۲) شیخ پورہ (۲۳) شیوہر (۲۴) کٹیہار (۲۵) کشن گنج (۲۶) کھگڑیا (۲۷) گیا (۲۸) گوپال گنج (۲۹) لکھی سرائے (۳۰) مدھے پورہ (۳۱) مدھوبنی (۳۲) مونگیر (۳۲) مظفر پور (۳۴) مشرقی

چمپارن (۳۵) مغربی چمپارن (۳۶) نالندہ (۳۷) نوادہ (۳۸) ویشالی۔

دارالسلطنت

صوبۂ بہار کا دارالسلطنت پٹنہ اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے امتیازی شان رکھتا ہے۔ قدیم زمانے سے اس شہر کے چاروں طرف دریاؤں نے اسے سرسبز بنا رکھا تھا، چنانچہ دورِ قدیم میں اس کو پھولوں کی سرزمین کہا جاتا تھا۔ عظیم آباد (پٹنہ) ایک ہزار سال تک ہندوستان کا عروس البلاد رہا۔ شیر شاہ سوری اور شہزادہ عظیم الشان نے اسے اپنا دارالحکومت بنایا۔ ۱۰۳۷ھ مطابق ۱۶۲۷ء میں مغلیہ شہنشاہ شاہ جہاں کا ہم زلف سیف خان صوبۂ بہار کا حاکم ہوا۔ اس کے عہد میں ایک بڑی عیدگاہ بنوائی گئی۔ جو محلّہ صادق پور سے شمال مغرب جانب اب تک قائم ہے اور چوک سے مشرق لب گنگا ایک بڑا مدرسہ اور مسجد تعمیر کروائی۔ مدرسہ کی یادگار اب صرف اس محلے کا نام رہ گیا ہے لیکن مسجد اب تک موجود ہے۔ یہاں کی مشہور ''پتھر کی مسجد'' کو شاہجہاں کے بھائی نے تعمیر کروائی تھی اور آج بھی اچھی حالت میں موجود ہے۔ علم وادب اور اسلامی تہذیب وتمدن کے لحاظ سے یہ شہر ہندوستان کے بڑے شہروں میں سے ایک ہے۔

فصیح الدین بلخی ایک یونانی محقق میگستھنز کے حوالے سے عہد قدیم کے پس منظر کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''گنگا کے پاٹ اور ایک دوسری ندی کے ملاپ کی جگہ پاٹلی پتر واقع ہے۔ یہ صورتاً مستطیل ہے اور اس کے چاروں طرف کاٹھ کی دیواریں ہیں جن میں تیر چلانے کے لیے سوراخ بنے ہوئے ہیں۔ شہر کی حفاظت کے لیے سامنے باہر کی جانب ایک خندق ہے اور شہر کا کثیف پانی بھی خندق میں نکل جاتا ہے۔ جن لوگوں کے ملک میں یہ شہر واقع ہے وہ سارے ہندوستان میں نہایت ممتاز ہیں''۔[۱۳]

تاریخ کے مطابق پٹنہ کو ۴۹۰ قبل مسیح میں مگدھ کے بادشاہ نے آباد کیا تھا جسے اس وقت پاٹلی پتر کہا جاتا تھا۔ اس شہر کا نام کئی بار تبدیل ہوا، پہلے پاٹلی پتر، پھر پٹنہ، پھر عظیم آباد، اِس وقت پٹنہ کے نام

سے جانا جاتا ہے۔ پٹنہ ہندومت کے ایک مقدس دیوی ''پٹن'' کے نام پر رکھا گیا ہے۔

عہد قدیم میں یہاں بڑے بڑے ماہر فلکیات اور فلسفی پیدا ہوئے ہیں۔ آریہ بھٹ، پانینی، چانکیہ اور کالی داس کا تعلق یہیں سے تھا۔ عہد موریہ میں یہاں کی آبادی چار لاکھ بتائی جاتی ہے۔ یہ اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا شہر تھا۔ موریہ اور گپت بادشاہوں کے عہد میں برصغیر کے سیاسی، ثقافتی مرکز کی حیثیت سے اس شہر نے عظیم خدمات انجام دی ہے۔ مسلم عہد حکومت میں بھی اس کو اہمیت حاصل تھی۔ شیر شاہ سوری نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا، عہد مغلیہ میں بھی یہ اہمیت کا حامل شہر مانا جاتا تھا۔

بدھ مت، ہندومت اور جین مت کے مقدس مقامات پٹنہ سے قریب ویشالی، راجگیر، نالندہ، بودھ گیا اور پاوا پوری میں واقع ہیں۔ اسی طرح سکھ مت کے لیے بھی یہ شہر مقدس تسلیم کیا جاتا ہے۔ سکھوں کے دسویں گرو ''گرو گوبند سنگھ'' یہیں مدفون ہیں۔

یہاں گنگا کے علاوہ سون، پن پن ندیاں بہتی ہیں۔ یہ شہر تقریباً ۳۵ کیلومیٹر لمبائی میں اور ۱۶ سے ۱۸ کیلومیٹر چوڑائی میں پھیلا ہوا ہے۔[۱۴] گنگا کے اوپر جو پل تعمیر کیا گیا ہے اسے دنیا کا سب سے لمبا پل کہا جاتا ہے۔

مذکورہ تحریر میں مختصراً ریاست بہار کا جغرافیائی نقشہ کھینچا گیا ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عہد قدیم سے لے کر عہد حاضر تک ہندوستانی تاریخ میں اس کی کیا اہمیت رہی ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ متحدہ بہار سے میری مراد جھارکھنڈ اور بہار ہے، کیونکہ ۲۰۰۰ء سے قبل تک جھارکھنڈ بہار کا ہی حصہ تھا۔ ۱۵ر نومبر ۲۰۰۰ عیسوی کو جھارکھنڈ بہار سے الگ ایک ریاست بنا، اسی لیے جب بہار کی تاریخ کی بات کی جائے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جھارکھنڈ کی بھی بعینہ تاریخ وہی ہے جو بہار کی ہے۔ صوبہ بہار کا صدر مقام پٹنہ ہے، انگریزوں کے دور حکومت سے لے کر کچھ عرصہ قبل تک موسم گرما کا صوبائی دارالخلافہ رانچی تھا لیکن جھارکھنڈ کی تقسیم کے بعد یہ سلسلہ رک گیا۔

۲۔ محمد سعید الحق، محمد بن قاسم سے اورنگ زیب تک، ناشر اریب پبلیکیشنز دریا گنج، دہلی، سن اشاعت ۲۰۰۷ء، ص: ۹۷

۳۔ پروفیسر محمد حبیب۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، جامع تاریخ ہند، ناشر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۱۹۸۴ء، ص:۶۷۲،۷۳
۴۔ R R Diwakar,Bihar Through the ages. page 2: 1959CE
۵۔ فصیح الدین بلخی، تاریخ مگدھ،، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ (بہار) ۱۹۴۴ء، ص:۹
۶۔ ایضاً، ص:۱۲
۷۔ ابوالفضل، آئین اکبری، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۷۲ء، ص:۴۱۶
۸۔ فصیح الدین بلخی، تاریخ مگدھ،، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ (بہار) ۱۹۴۴ء، ص:۱۱
۹۔ https://en.wikipedia.org/wiki/Main_Page
۱۰۔ ایضاً، ص:۸۷
۱۱۔ مولانا عبدالحی حسنی، **الھند فی العھد الاسلامی، مجمع الامام احمد بن عرفان شھید دار عرفات الھند، ۲۰۰۱ء**، ص:۸۲
۱۲۔ فصیح الدین بلخی، تاریخ مگدھ،، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ (بہار) ۱۹۴۴ء، ص:۱۰۴
۱۳۔ ایضاً، ص:۳۳
۱۴۔ 14 ـ https://en.wikipedia.org/wiki/Main_Page

محمد اسامہ *

مدارس کی تعمیر وترقی میں وحدتِ تعلیم کا کردار

مسلمانوں کے دورِعروج کی خاص بات یہ رہی کہ اس دوران علم کا چرچا عام ہوا۔اہل اسلام کے ساتھ دیگر مذاہب کے ماننے والوں نے بھی حصول علم پر خصوصی توجہ دی اور مذہب ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنا۔اس کی سب سے اہم وجہ یہ رہی کہ علم پر کسی خاص طبقے کی اجارہ داری نہیں تھی اور اسلام نے علم کے حصول کو صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اسے سب کے لیے عام کر دیا تھا۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ اس دور میں بلاتفریق قوم وملت ہر کسی نے علم کی اس عمومی تحریک سے فائدہ اٹھایا ہے اور نسل انسانی کو فیض پہنچایا،خواہ وہ یہودی ہوں یا عیسائی، زرتشت، ذمی، موالی اور غلام ہوں، مزید برآں اس دور میں علوم کی تقسیم بھی نہیں کی گئی تھی۔ مسلم تاریخ میں مختلف میدانوں کے تحت ایسے کارناموں کی ایک لمبی فہرست ملے گی جن کو نہ صرف انہوں نے انجام دیا ہے بلکہ انہیں مسلم حکم رانوں کی سرپرستی بھی حاصل رہی۔شبلی نعمانی اس کے اعتراف میں لکھتے ہیں:

''.....منصور کا شوق علمی دیکھ کر دور دور سے مترجمین اور حکماء اس کے دربار

☆ گیسٹ فیکلٹی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ای میل: usama9911@gmail.com

میں آنا شروع ہوئے۔ جرجیورس، فرات بن کناثا، بطریق (یہ سب عیسائی عالم تھے) نوبخت منجم، ابوسہل (مجوسی تھے)، ابن المقفع اس کے دربار کے مشہور مترجم اور حکیم تھے۔ بطریق نے یونانی اور ابن المقفع نے فارسی زبان سے ترجمہ کیے۔ ۱۵۶ ہجری میں ہندوستان کا ایک بڑا ریاضی داں ہندو عالم منصور کی پایہ شناسی کا شہرہ سن کر دارالخلافہ میں داخل ہوا، اس نے ایک نہایت عمدہ زیچ جس کو اس نے ایک عمدہ اور جامع تصنیف سے جو ایک بادشاہ ہندوستان مسمی بہ بیگر کی طرف منسوب ہے خلاصہ کیا تھا، منصور کی خدمت میں پیش کی۔''[1]

مسلمانوں کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ انہوں نے اپنے دورِ زوال میں عیسائی یورپ کے زیر اثر علم کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا، یعنی دینی علوم اور دنیاوی علوم۔ یہ بھی المیہ ہی کہا جائے گا کہ اس تقسیم میں اہل مدارس بھی بہ رضا و رغبت شریک ہیں۔ ان میں تعلیم کے حوالے سے دین و دنیا کی تفریق پیدا ہوگئی اور وہ دنیاوی تعلیم کو غیر ضروری سمجھنے لگے۔ دینی تعلیم کو لے کر جو عمل اختیار کیا گیا اس میں عبادات اور معاملات دونوں کے ساتھ ایک ہی رویہ اختیار کیا گیا اور کسی میں تبدیلی گوارہ نہیں کی گئی، جب کہ معاملات میں زمانے اور حالات کے اعتبار سے جائز تبدیلی قبول کر لینا ضروری تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بالعموم جو زمانے میں ہو رہا وہ مدارس میں نہیں پڑھایا جا رہا اور جو مدارس میں پڑھایا جا رہا وہ زمانے میں نہیں ہو رہا۔ ایسے میں مدارس وطلبہ سے دنیا کی امامت اور رہنمائی کی توقع کیوں کر کی جاسکتی ہے؟ نیز انہیں علمی میدان میں ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے اور وہ دیگر قوموں کے مقابلے دن بہ دن پیچھے ہوتے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے متعدد اسباب ہیں، لیکن سب سے اہم سبب اہل مدارس کا دینی و دنیاوی تعلیم میں تفریق کرنا ہے، جب کہ اسلام نے ہمیشہ وحدت تعلیم کی تاکید کی ہے۔

اسلام میں علمی وحدت کا تصور

اسلام نے تحصیلِ علم پر خصوصی زور دیا ہے اور اس میں مرد اور عورت کے درمیان تفریق نہیں

کی، نیز اسے دونوں کے لیے یکساں ولازمی قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُونَ. [۲] (ان سے پوچھو! کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہوسکتے ہیں؟)

احادیث میں بھی علم کی فضیلت کثرت سے بیان کی گئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

طلب العلم فريضة على كل مسلم. [۳] (ہر مسلمان پر خواہ وہ مرد یا عورت علم حاصل کرنا فرض ہے۔)

قرآن وسنت سے یہ بات واضح ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو حصول علم کی کثرت سے تاکید کرتا ہے اور اس میں اس نے دینی اور دنیوی علوم کی تقسیم نہیں کی ہے، البتہ اسلام نے دینی ودنیاوی علوم کی تقسیم کی جگہ نافع اور غیر نافع علم کی تقسیم کی ہے اور یہی عقل سلیم بھی کہتی ہے۔ اس حوالے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

اللهم انى اعوذ بک من علم لا ينفع. [۴] (اے اللہ! میں ایسے علم سے جو نفع دینے والا نہ ہو، آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔)

ایک اور حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللهم انى اسألک علما نافعاً. [۵] (اے اللہ! میں ایسے علم کا جو نفع دینے والا ہو، سوال کرتا ہوں۔)

درج بالا احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ دینی ودنیاوی علوم کی تفریق اسلامی فکر کے خلاف ہے۔ ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے دینی ودنیاوی علوم کی تقسیم کو اسلام کے منشاء کے خلاف بتایا ہے:

> ''اسلام میں سرے سے انسانی زندگی کے معاملات کی یہ تقسیم ہی نہیں کہ زندگی کے یہ امور دینی ہیں اور یہ غیر دینی۔ دین ودنیا کی تقسیم ہی غیر اسلامی اور مسیحی مغرب درآمد شدہ ہے اور جو ہمارے معاشرے بعض اداروں اور لوگوں کے بارے میں دینی اور غیر دینی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، اس

تقسیم کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ تاریخ اسلام میں آخری دور تک یہ تقسیم وجود میں نہیں آئی تھی کہ تعلیم کے ایک حصہ کو دینی تعلیم کہا جائے اور اس کے دوسرے حصے کو غیر دینی اور غیر مذہبی تعلیم کہا جائے۔ کچھ ایسے افراد ہوں جنھیں مذہبی لوگ یا رجال دین کہا جائے اور دوسرے لوگ رجال علم، اہل سیاست اور اہل دنیا کہلائیں۔''[۶]

اسلام کے مطابق مذہب اور سائنس کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ قرآن کریم نے دونوں کا ذکر بالعموم اکٹھے کیا ہے اور اس کی مختلف آیات کائنات کے اسرار و رموز پر غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔[۷] یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں قرآن کریم سے دینی اور دنیوی دونوں علوم کو اخذ کیا چناں چہ **علم القرأت و التجوید، علم النحو، علم التفسیر، علم الأصول، علم الکلام، علم الفقه، علم القصص، علم التاریخ، علم الجغرافیه و المواصلات، علم الفرائض، علم المیراث، علم تعبیر الرؤیا، علم التذکیر، علم المعانی، علم البدیع، علم البیان، علم التصوف، علم المیقات، علم الطب، علم الجراحت، علم الهئیة و الفلکیات، علم البصریات، علم النجوم، علم النباتات، علم الهندسه، علم الجدل، علم الجبر و المقابله اور علم الکیمیاء** وغیرہ اس کی واضح مثالیں ہیں۔ یہ وہ علوم ہیں جو مدارس کی تعمیر و ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ اس کا ثبوت ہمیں اسلامی تاریخ میں مسلمانوں کے دورِ عروج کے ان ترقی یافتہ مدارس بھی سے ملتا ہے جن میں وحدت تعلیم کا تصور عام تھا۔

علمی تفریق کے اسباب

مسلمانوں کے دور عروج میں علمی وحدت کا پورا خیال رکھا گیا اور اس کی کوئی تقسیم نہیں کی گئی کیوں کہ ایک اچھے انسانی معاشرے کی تشکیل میں تمام علوم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ رب العزت نے بھی اسی پر زور دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے حضرت آدمؑ کو تمام اشیاء کا علم دیا تھا جیسا کہ اس کا فرمان مبارک ہے:

وَعَلَّمَ آدَمَ الأَسْمَاء كُلَّهَا. [۸] (اور اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو ساری چیزوں

کے نام سکھائے۔)

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم معاشرہ پرسکون اور ترقی یافتہ تھا۔ جہاں ایک طرف مال و دولت کی فراوانی تھی اور امن وسکون تھا، وہیں دوسری طرف مسلمانوں نے سائنس وٹکنالوجی میں دیگر قوموں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔اس وقت فارغینِ مدارس ہی کتاب وسنت کا درس دیتے، مثالی کردار پیش کرتے، عدالتی دستاویز پڑھتے، لوگوں کی جائیداد تقسیم کرتے اور ان کے اختلافات کو حل کرتے تھے۔ وہ آج کے فارغین کی طرح صرف نکاح خواں، میلاد، جنازہ پڑھانے والے یا دو رکعت کے امام نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ عوام کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی پر پوری نظر رکھتے تھے اور ان کی رہنمائی فرماتے تھے۔ان کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ انہوں نے اپنے دورِ زوال میں علم کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا۔مؤرخین اور مفکرین نے اس کے متعدد اسباب لکھے ہیں، جیسے اس کا آغاز ۱۲۵۸ء میں بغداد کے زوال سے ہوا، جب تاتاریوں نے مدارس، کتب خانوں، رصدگاہوں کے علاوہ علماء کرام اور سائنس دانوں کی ایک بڑی تعداد کو تباہ و برباد کر دیا۔مسلمانوں کی اکثریت مایوسی کا شکار ہو کر گوشہ نشین ہوگئی اور انہوں نے خود کو دنیا سے بے نیاز کرلیا۔رہی سہی کسر ۱۴۹۲ء میں سقوط غرناطہ نے پوری کر دی، جب مغرب نے نہ صرف اسلامی اسپین پر قبضہ کیا بلکہ مسلمانوں کے علمی ورثہ کو اپنے یہاں منتقل کرلیا، نیز ان کی ایجاد واختراع کو بھی اپنی طرف منسوب کرلیا۔حقیقت یہ ہے کہ اس تقسیم میں مغرب کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کا اہم کردار رہا، کیوں کہ اسی کے نتیجے میں کلیسا اور سائنس کے درمیان کشمکش کا آغاز ہوا اور بالآخر مغربی مفکرین اور فلاسفہ کو طویل قربانیوں کے بعد کامیابی ملی۔اس تحریک کے علم برداروں میں بنیادی طور پر دو عوامل یعنی یونانی فلسفہ سے محبت اور دین و مذہب سے بیزاری کا غلبہ رہا اور ان کے اثرات تعلیم پر بھی مرتب ہوئے، چنانچہ دینی ودنیاوی علوم کی تقسیم کر دی گئی۔

ایسی ہی کچھ صورت حال برصغیر کے مسلمانوں کو پیش آئی، جب تک یہاں مسلمان حکم راں رہے، علوم کی تفریق نہیں ہوئی، نیز وہ بلاتفریق ملت علم وفن کے فروغ میں کوشاں رہے۔اکثر مدارس میں دینی اور دنیوی دونوں طرح کی تعلیم رائج تھی۔ابوالفضل نے آئین اکبری میں اپنے دور کے نصاب تعلیم میں اخلاقیات، ریاضیات، اقلیدس، مساحت، ہیئت، رمل، قواعد مال، آئین سلطنت، طب، طبعیات، الٰہیات اور تاریخ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔اس کی تائید سید ابوالحسن علی ندوی کی اس تحریر

سے بھی ہوتی ہے:

''تعلیم کی موجودہ ثنویت یا دوئی غیر اسلامی اقتدار کے عہد کی بدعت ہے۔ پہلے ہمارا نظام تعلیم وحدانی اور سلیت پر مبنی تھا۔ ہمارا قدیم نصاب تعلیم جس کی درس نظامی نمائندگی کرتا ہے۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ملک کا واحد نظام تعلیم وثقافت اور ذہنی تربیت کا واحد ذریعہ تھا۔ یہ جہاں محدث، فقیہ اور مدرس تیار کرتا تھا، وہاں سول سروس کے عہدہ دار اور ارکان سلطنت بھی مہیا کرتا۔ اس درس کی پیداوار جس طرح ملا محبّ اللہ بہاری اور ملا عبدالحکیم سیال کوٹی تھے، اسی طرح علامہ سعد اللہ وزیر سلطنت بھی تھے۔ یہی حال دوسرے ملکوں میں بھی تھا کہ دینی و دنیوی تعلیم کے دو الگ الگ نصاب اور نظام نہیں تھے۔ چناں چہ سب کو معلوم ہے کہ مشہور ریاضی داں شاعر عمر خیام اور سلطنت سلجوقیہ کا وزیر با تدبیر نظام الملک طوسی دونوں ایک ہی حلقہ درس کے شریک اور ایک ہی تعلیم کی پیداوار تھے۔''[۹]

چوں کہ ہندوستان میں تعلیم کی بنیاد مذہب پر تھی، اس لیے دنیوی علوم کے ماہرین کی تعلیم و تربیت مذہبی ماحول میں ہوتی تھی اور ان کے افکار ونظریات بالعموم مذہب کے مطابق ہوا کرتے تھے، جب کہ مذہبی علوم کے ماہرین کو دنیوی علوم پر بھی دسترس ہوا کرتی تھی۔ دونوں کے درمیان ایک حسین امتزاج تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ معاشرہ انتہائی تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ پرسکون بھی تھا۔ اس کی گواہی ۲؍فروری ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے (Lord Macaulay) نے انگلینڈ کے پارلیمنٹ میں دورانِ تقریر دی:

''میں ہندوستان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھر آیا ہوں، نہ مجھے کوئی چور ملا ہے اور نہ بھکاری۔ دولت کی فراوانی تھی، امن و سکون بھرپور تھا، اخلاقی اقدار اعلیٰ پیمانے موجود تھیں، ایسی قوم پر نہ کوئی حکومت کرسکتا ہے اور نہ کوئی اسے فتح کرسکتا ہے۔''[۱۰]

تعلیمی نظام میں تبدیلی تب نظر آنے لگی جب برصغیر میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد

انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی (۱۶۰۳ء) کے ذریعے اپنے قدم جمانے شروع کیے۔اٹھارہویں صدی کے وسط تک اس نے قدیم طریقہ تعلیم میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور ملک کی سرکاری زبان فارسی ہی رہی۔۱۷۹۷ء میں سرچارلس گرانٹ کی تحریک سے جدید انگریزی تعلیم کا آغاز ہوتا ہے جس سے مسلمانوں نے مختلف اسباب کی وجہ سے نہ کے برابر اور ہندوؤں نے بہ کثرت فائدہ اٹھایا۔پھر انگریزوں نے مناسب وقت دیکھ کر مسلمانوں کے تعلیمی نظام کو ختم کر دیا اور اپنا مغربی تعلیمی نظام جس کی بنیاد سائنس اور تجربات پر تھی، نافذ کر دیا، بقول ہنٹر:

> ''.....مسلمانوں کے طریقہ تعلیم سے فائدہ اٹھاتے رہے،اس دوران ہم نے اپنا طریقہ تعلیم بھی رائج کرنا شروع کر دیا تھا۔پھر جوں ہی ایک نسل اس نئے طریقے کے تحت پیدا ہوگئی ہم نے مسلمانوں کے پرانے طریقے کو خیرآباد کہہ دیا جس سے مسلم نوجوانوں پر ہر قسم کی سرکاری زندگی کا دروازہ بند ہوگیا۔''[۱۱]

۱۸۳۴ء میں فارسی زبان سرکاری دفاتر سے خارج کر دی گئی۔۱۸۴۹ء سے سرکاری نوکری میں انگریزی زبان سے واقف افراد کو ترجیح دی جانے لگی۔ان سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہبی اداروں سے نکلنے والے فنی ماہرین معاشرے میں اپنا کوئی کردار ادا نہ کر سکے اور پھر رفتہ رفتہ ان اداروں سے دنیوی علوم کی تدریس کا سلسلہ ختم ہوتا چلا گیا۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی میں مسلمانوں کو سیاسی ،معاشی اور تعلیمی میدان میں نقصان اٹھانا پڑا اور انہیں ہر طرح سے حاشیے پر کر دیا گیا۔اسی طرح مدارس کا نظام بھی مکمل طور پر سبوتاژ کر دیا گیا اور ہزاروں کی تعداد میں مدارس بند کر دیے گئے۔ان حالات میں مسلمانوں کے دو فکری دھارے وجود میں آئے۔ایک نے دینی علوم پر صرف توجہ دی اور اسی میں ترقی کا راز سمجھا، چنانچہ مختلف جگہوں پر مدارس قائم کیے گئے جہاں صرف دینی علوم کی تدریس دی جاتی ہے۔اس کی قیادت ان علمائے کرام کے ہاتھوں میں تھی جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م:۱۷۶۳ء) کے بیٹوں کے تربیت یافتہ تھے، ان میں مولانا امداداللہ مہاجر مکی (م:۱۸۹۹ء)،مولانا رحمت اللہ کیرانوی (م:۱۸۹۰ء)،مولانا قاسم نانوتوی(م:۱۸۸۰ء)،مولانا مملوک علی (م:۱۸۵۱ء)، حضرت سید احمد شہید(م:۱۸۳۱ء)،مولانا اسمٰعیل شہید(م:۱۸۳۱ء)،مولانا محمد علی مونگیری(م:۱۹۲۷ء)، علامہ شبلی

نعمانی (م:۱۹۱۴)،مولانا رشید احمد گنگوہی (م:۱۹۰۵ء)اور شیخ محمد عبدہ (م:۱۹۰۵ء) وغیرھم مشہور ہیں۔دوسرے طبقے نے دنیاوی تعلیم کو ہی کل کائنات سمجھا اور اسکول ،کالج اور یونی ورسٹیاں قائم کیں،اس کی قیادت سرسید احمد خان (م۱۸۹۸ء) کررہے تھے،انہوں نے اصلاح کے نام پر تجدد کی راہ اختیار کی۔

علمی تفریق کے مضر اثرات

درج بالا اسباب کی بنیاد پر علوم کی تقسیم ہوئی جو اب تک چلی آرہی ہے۔دونوں طبقوں کے درمیان ایک خلیج قائم ہے،دونوں خود کو صحیح سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے کو علم کی دوری کی بنا پر اپنا مخالف اور متضاد سمجھنے لگے ہیں،نیز فی الحال کوئی بھی تبدیلی کے لیے تیار نظر نہیں آرہا ہے۔اس وقت بالعموم صورت حال کچھ یوں ہے کہ فارغین مدارس دنیاوی علوم سے نابلد ہیں چنانچہ جب وہ عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو وہ نہ صرف سماجی،تعلیمی بلکہ معاشی مسائل کا بھی سامنا کرتے ہیں۔ان میں سے اکثریت کی نوکری مساجد،کاتب اور مدارس تک محدود ہوتی ہے جس کی وجہ سے مناظرہ بازی،آپسی لعن طعن اور فرقہ بازی کو جلا ملتی ہے۔اگرچہ کچھ مدارس نے قدیم وجدید تعلیم میں بیچ کی راہ نکالنی چاہی ہے لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔

وحدت تعلیم کا نظریہ اور بعض مفکرین

مدارس کے ارباب حل وعقد کو درج بالا سوالات پر غور وفکر کرنا چاہیے اور انہیں تعلیم کی وحدت پر پھر سے زور دینا چاہیے،کیوں کہ معاشرے میں جہاں ایک طرف مادی یا دنیاوی علوم کی ضرورت ہے وہیں دوسری طرف روحانی اور مذہبی علوم کی تعلیم بھی ضروری ہے،چنانچہ جب تک مادی،حیاتیاتی،نفسیاتی اور مذہبی علوم میں فکری روابط کو مضبوط نہیں بنایا جاتا اس وقت تک ایک بہتر انسانی معاشرہ کی خواہش رکھنا صرف خواب ہی ثابت ہوگا۔مغربی معاشرے کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ اس نے صرف مادیت پر توجہ دی اور وحیِ الٰہی کو نظر انداز کردیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی تمام تر خوش حالی اور ترقی کے باوجود نامکمل اور ناآسودہ ہے۔متعدد محققین اور مفکرین نے اہل مدارس کو اس طرف متوجہ کیا ہے،جیسے

مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب میں وحدت تعلیم کا نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھا:

''دینیات کی عمومی تعلیم کے لیے جب تین یا زیادہ سے زیادہ چار کتابوں کو پڑھ لینا کافی خیال کیا گیا تھا اور زیادہ وقت غیر دینی علوم ہی کی تعلیم میں صرف ہوتا تھا تو آج بھی کیا یہ ممکن نہیں کہ غیر دینی علوم کے اس حصہ کو جس کے اکثر نظریات ومسائل مسترد ہو چکے ہیں، کم از کم دنیا میں ان کی مانگ باقی نہیں رہی ہے، ان کو نکال کر عصر جدید کے مقبولہ علوم اور عہد حاضر کی دفتری زبان انگریزی کے نصاب کو قبول کر کے مذہب کی تعلیم کو ان ہی تین کتابوں کے معیار کے مطابق باقی رکھتے ہوئے دینی اور دنیاوی تعلیم کے مدارس کی اس تفریق کو ختم کر دیا جائے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے حکومت سے یہ استدعا کی جائے کہ جیسے پہلے ان کی تعلیم میں دین کا عنصر ہر زمانہ میں ایک لازمی اور ضروری مضمون کی حیثیت رکھتا تھا، اب بھی اس عنصر کو لازم کر دیا جائے اور اس طور پر لازم کر دیا جائے کہ جیسے درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے دین کا علم ان کتابوں کے معیار کے مطابق اپنے پاس رکھتے تھے، اسی طرح بی اے کی تعلیم سے فارغ ہونے والے اس زمانہ میں بھی اس حد تک مذہب کے عالم ہو کر نکلا کریں، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پھر دینیات کے مدارس کے نام سے الگ مدرسوں کے قائم کرنے کی ضرورت مسلمانوں کو باقی نہیں رہے گی، ہر عالم اس وقت گریجویٹ ہوگا اور ہر گریجویٹ عالم ملا ہی مسٹر ہوں گے اور مسٹر ملا عالم وتعلیم یافتہ کی تفریق کا قصہ ختم ہو جائے گا۔''[۱۲]

مناظر احسن گیلانی کی درج بالا تجویز کتنی مفید ہے، اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں بی اے، سال اول کے تمام طلبہ وطالبات کو سوائے انجینئرنگ کے، خواہ وہ کسی بھی کورس کے ہوں، اسلامیات کے نام سے ایک لازمی پرچہ پڑھایا جاتا ہے، جس میں اسلام کے بنیادی عقائد، ارکان، اسلامی تاریخ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی ومدنی زندگی، خلفاء

راشدین کی حیات وخدمات، قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف وغیرہ کی بنیادی اور ضروری تعلیم دی جاتی ہے۔اس کا فائدہ یہ ہے کہ طلبہ وطالبات خواہ وہ کسی بھی اسکول سے ہوں اور وہ گریجویشن کسی بھی میدان میں کر رہے ہوں، اسلام کے حوالے سے بنیادی اور اہم باتوں سے واقف ہو جاتے ہیں۔

شبلی نعمانی بھی وحدت تعلیم کے قائل نظر آتے ہیں، البتہ انہوں نے اپنے نظریے میں قدیم اور جدید دونوں طرح کے تعلیمی اداروں کو اپنی اپنی جگہ برقرار رکھا ہے، صرف ان کے نصابوں کو دور جدید کے تقاضوں کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ دونوں گروہ اب قوم کے ضروری اجزاء ہیں ،اس لیے دونوں کو آپس میں دست وبازو ہو کر کام کرنا چاہیے۔انہوں نے قدیم اور جدید تعلیم کے حصول کے حوالے سے لکھا:

> ''ہم مسلمانوں کے لیے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے، نہ قدیم عربی مدرسوں کی، ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے، جس کا ایک جز مشرقی اور دوسرا مغربی ہے۔''[۱۳]

مزید برآں شبلی نعمانی نے اسکول سے کالج تک درجہ بدرجہ تین موضوعات عقائد، فقہ اور تاریخ اسلام کی کتابوں کی تدریس پر زور دیا ہے، یعنی اسکول میں عقائد کی سادہ تعلیم کے علاوہ فقہ اور تاریخ اسلام کا احاطہ کیا جائے اور کالجوں میں امام غزالی، ابن رشد اور شاہ ولی اللہؒ کی مخصوص کتابوں کو عربی زبان میں ہی پڑھایا جائے، البتہ ان کی مجموعی ضخامت سو یا دو سو صفحات سے زائد نہ ہو، نیز دینیات کے نتائج کو انگریزی تعلیم کے نتائج کی طرح لازمی قرار دینے کی تاکید کی ہے۔اسی طرح لکھا ہے کہ مذہبی علماء کی تنخواہیں اچھی مقرر کی جائیں، وعظ کے موقع پر ارکان کالج کی زیادہ سے زیادہ حاضری کو ممکن بنایا جائے اور دو چار طلبہ کو سند حاصل کرنے کے بعد گراں قدر وظائف دے کر انہیں اعلیٰ درجے کی مذہبی تعلیم دلائی جائے۔ جہاں تک مدارس کی بات ہے تو ان کے فارغین سے دیہاتوں اور دور دراز کے علاقوں کے جاہل مسلمانوں میں دین کی تبلیغ، احکام اسلامی کی نشر واشاعت اور مساجد کی امامت وفتاویٰ وغیرہ کا کام لیا جاسکتا ہے۔[۱۴]

سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی دینی ودنیاوی علوم کی تقسیم کو ختم کرنے کے قائل تھے، چنانچہ وہ اس حوالے سے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''دوسری چیز جوہمیں اپنے نظام تعلیم میں بہ طور اصول کے پیش نظر رکھنی چاہیے، وہ یہ ہے کہ ہم نظام تعلیم سے دین اور دنیا کی اس تفریق کو ختم کردیں۔ دین ودنیا کی اس تفریق کا یہ تخیل ایک عیسائی تخیل ہے، ہم اس کے بالکل قائل نہیں ہیں کہ ہماری ایک تعلیم دنیوی ہواور ایک تعلیم دینی۔''[۱۵]

البتہ مولانا مودودی موجودہ رائج قدیم اور جدید تعلیمی نظام سے متفق نہیں ہیں۔ اسی طرح وہ اسے بھی صحیح نہیں سمجھتے ہیں کہ علوم اسلامی کے ساتھ مروجہ جدید علوم کو ملا دیا جائے، کیوں کہ مؤخر الذکر کی بنیاد ناخدا شناس لوگوں کی فکر وتحقیق پر ہے۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''اگر آپ ایک طرف پرانے علوم کو پرانی ترتیب کے ساتھ اور نئے علوم کو اس خاص ترتیب کے ساتھ جو اس وقت پائی جاتی ہے، ملا کر پڑھائیں گے تو ان دو متضاد طاقتوں کے میل سے عجیب عجیب قسم کے مرکبات پیدا ہوں گے۔ کوئی پرانے علوم سے مغلوب ہوگا تو مولوی بن جائے گا اور کوئی نئے علوم سے مفتوح ہوگا تو مسٹریت کی طرف چلا جائے گا، بلکہ کامریڈیت تک جا پہنچے گا۔ کوئی دونوں کے درمیان مذبذب ہو کر مضمحل ہو جائے گا۔''[۱۶]

مولانا مودودی اس بات کے بھی قائل نہیں ہیں کہ موجودہ یونی ورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں وغیرہ کے تعلیمی نصاب میں دینیات کے کورس کو الگ سے شامل کر دیا جائے، کیوں کہ یہ تقریباً پچانویں فیصد لاحاصل ہے اور باقی ماندہ پانچ فیصد لوگوں کا حال بھی یہی ہوگا کہ وہ کچھ مدت تک کفر کے راستے پر خدا کا نام لیتے ہوئے چلتے رہیں گے۔ اس کا تجربہ سرسید نے اپنے دور میں کیا تھا اور دینیات کو اس غرض سے نصاب کا حصہ بنایا گیا تھا کہ طلبہ وطالبات اپنے دین پر قائم رہیں، لیکن ان کو مایوسی ہی ہاتھ آئی اور اس کا اعتراف سرسید نے اپنی زندگی کے آخری حصے میں کیا تھا۔ سید مودودی نے اپنے تعلیم نظام کے خاکہ میں اس بات پر خصوصی زور دیا ہے کہ اس میں دینیات کے الگ سے کورس کی ضرورت نہیں، بلکہ سارے کورس کو دینیات کے کورس میں تبدیل کر دینا چاہیے، یعنی تمام موضوعات کا مرکز خدائے باری

تعالیٰ ہو۔ مزید برآں ابتدائی آٹھ دس سالوں میں ایک طالب علم کو اسلام کی بنیادی تعلیمات دے دی جائے اور پھر اسے اختصاصی تعلیم کے الگ الگ کورسز میں آزادنہ داخل ہونے کا اختیار دیا جائے، یعنی ہر طالب علم کو مجموعہ علوم بنانے اور تکمیل کے بعد 'مولانا' یا 'مفتی' کا خطاب دینے کے بجائے اسے کسی ایک مخصوص میدان کا ماہر بنایا جائے، کیوں کہ انسان کا علم اب اتنی ترقی کر چکا ہے کہ کسی ایک شخص کے لیے تمام علوم کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ [۱۷]

خلاصہ

راقم الحروف کی ہندوستان کے پس منظر میں وحدت تعلیم کے حوالے سے یہ رائے ہے کہ اب اس کا کلیۃً اطلاق ممکن نہیں ہے، نیز دینی و دنیوی تعلیم کی تفریق کو ختم کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا یہاں سے اقتدار ختم ہو چکا ہے اور اب جن کے ہاتھوں میں حکومت ہے، وہ اسکولوں اور کالجوں میں دینی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دے سکتے۔ ہاں، یہ ممکن ہے کہ اس حوالے سے مدارس میں تبدیلی لائی جائے، کیوں کہ ہر تعلیمی نظام کے نصاب میں کچھ چیزیں اصولی اور دائمی ہوتی ہیں اور کچھ وقتی یا تغیر پذیر۔ مدارس کے نصاب میں یہ بات تو دائمی ہے کہ اس میں قرآن، حدیث، فقہ اور عربی زبان وادب کی تعلیم دی جائے گی، لیکن ان علوم کی تعلیم کیسے، کب اور کتنی دی جائے؟ یہ اجتہادی مسئلہ ہے اور اس میں وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح ان علوم کے ساتھ کس طرح کے دیگر معاون علوم شامل کیے جائیں گے، یہ بھی تغیر پذیر امر ہے۔ اہل مدارس مناظر احسن گیلانی، شبلی نعمانی، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور بعض دیگر مفکرین کے وحدت تعلیم سے متعلق بعض افکار و نظریات کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں کہ وہ اپنے طلبہ و طالبات کو دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم دیں یا کم از کم انہیں دورانِ تعلیم جدید علوم کے حصول سے نہ روکیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ وہ انہیں اس کی طرف توجہ دلائیں اور اس سلسلے میں ان کی مدد کریں اور اگر اتنا نہیں کر سکتے تو کم از کم اس میں رکاوٹ نہ ڈالیں، ورنہ دینی اور دنیاوی علوم کی تقسیم سے امت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ اس حوالے سے میں آپ کے سامنے دو مثال پیش کرتا ہوں۔ ایک طالب علم نے ہندوستان کے مشہور و معروف مدرسہ میں تعلیم حاصل کی اور پھر جے این یو سے عربی میں بی اے، ایم اے اور پی ایچ ڈی کی

سند بھی لی،لیکن جب اس نے پاسپورٹ/ویزا کے لیے درخواست دی تو اسے ہائی اسکول کی سند نہ دکھا پانے کی وجہ سے خود کو 'جاہل' کے درجے میں شمار کرانا پڑا۔اس کے برعکس بعض طلبہ نے ایک مدرسہ میں دورانِ تدریس ہائی اسکول کیا اور پھر انہوں نے انٹر کے بعد مختلف پروفیشنل کورسز میں کامیابی کے ساتھ ڈگری لی۔اب الحمد اللہ وہ جہاں ایک طرف دین کا علم رکھتے ہیں وہیں دوسری طرف طب،انجینئرنگ،فن تعمیر اور اسی طرح کے دوسرے میدانوں میں بھی اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔اہل مدارس کو کیتھولک عیسائیوں سے سبق لینا چاہیے جو اپنی درس گاہوں میں جہاں مذہبی تعلیم دیتے ہیں وہیں دوسری طرف طالب علموں کو پوری آزادی رہتی ہے کہ وہ میڈیکل،سوشل ورک اور دوسرے جدید مضامین کی بھی تعلیم حاصل کریں۔اس طرح وہ ایک طرف اپنی قوم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور دوسری طرف انسانیت کی خدمت میں بھی حصہ لیتے ہیں اور سماج میں باعزت زندگی گزارتے ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ نعمانی،شبلی،مقالات شبلی،دارالمصنفین شبلی اکیڈمی،اعظم گڑھ،۲۰۰۹ء،جلد سوم،ص:۱۳

۲۔ الزمر:۹

۳۔ ابن ماجہ:۲۲۴

۴۔ الترمذی،کتاب الدعوات،رقم:۳۴۸۲

۵۔ ابن ماجہ،کتاب الصلاۃ،رقم:۹۲۵

۶۔ القرضاوی،یوسف،اسلام اور سیکولرزم-ایک موازنہ،مترجم:صدیقی،ساجد الرحمٰن،عالمی ادارہ فکر اسلامی،اسلام آباد،۱۹۹۷ء،ص:۵۳

۷۔ راقم نے اس حوالے سے بعض اہم آیات کا یہاں ذکر کیا ہے ورنہ ان کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے،ملاحظہ ہو: الانبیاء:۳۴-۳۰،نوح:۲۰-۱۴،السجدہ:۹-۴،یٰسین:۴۰،الانشقاق:۲۰-۱۸،البقرۃ:۱۶۴،آل عمران:۱۹۱-۱۹۰

۸۔ البقرۃ:۳۱

۹۔ ندوۃ العلماء کا کتابچہ:۶۸-۶۷،بہ حوالہ عربی اسلامی مدارس کا نصاب ونظام تعلیم اور عصری تقاضے،خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری،پٹنہ،۱۹۹۵ء،ص:۱۳-۱۲

۱۰۔ بہ حوالہ رپورٹ،علماء سیمینار،پرامن اور متوازن معاشرے کے قیام میں علماء کا کردار،۲۲،۲۳/جون ۲۰۱۱ء،پاک

انسٹی ٹیوٹ فار پیس اسٹڈیز، اسلام آباد۔ لارڈ میکالے کے یہ الفاظ ہندوستان میں بہت عام ہوئے اور مختلف کتابوں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے، لیکن راقم نے اس کی جب تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ فرضی بات ہے جو اس کی جانب منسوب کر دی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:

https://www.thefridaytimes.com/the-infamous-macaulay-speech-that-never-was/

https://thewire.in/history/macaulays-speech-never-delivered

https://en.wikipedia.org/wiki/Talk:Thomas_Babington_Macaulay

۱۱۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، ہمارے ہندوستانی مسلمان، مترجم: ڈاکٹر صادق حسین، مکی دارالکتب، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص: ۱۵۱

۱۲۔ گیلانی، مناظر احسن، پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، مکتبہ رحمانیہ، اقراء سنٹر، اردو بازار، لاہور، سن اشاعت غیر مذکورہ، طبع اول، جلد دوم، ص: ۷

۱۳۔ نعمانی شبلی، مقالات شبلی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۹ء، جلد سوم، ص: ۱۶۳

۱۴۔ ملاحظہ ہو: مقالات شبلی، جلد سوم، صفحات: ۱۴۶-۱۴۱

۱۵۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، اسلامی نظام تعلیم، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی، ص: ۱۵

۱۶۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، نیا نظام تعلیم، دفتر رسالہ ترجمان القرآن، لاہور، سن اشاعت غیر مذکورہ، صفحات: ۲۳-۲۲

۱۷۔ ملاحظہ ہو: نیا نظام تعلیم، صفحات: ۳۰-۲۳

اسلام اور عصرِ جدید (سہ ماہی)

کے خاص شمارے

سیرت ومغازی کی اولین کتابیں اور ان کے مؤلفین............۲۰۰روپے
اسلامی تہذیب وتمدن (دورِجاہلیت سے آغازِ اسلام تک)............۳۰۰روپے
نذرِ علی محمد خسرو............۱۰۰روپے
بیاد خواجہ غلام السیّدین............۱۰۰روپے
بیاد پروفیسر مشیر الحق............۲۰۰روپے
افکارِ ذاکر............۱۵۰روپے
مولانا عبیداللہ سندھی............۲۰۰روپے
ڈاکٹر سید عابد حسین اور نئی روشنی............۲۵۰روپے
مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت............۱۵۰روپے
نذرِ رومی............۲۰۰روپے
قرآن مجید، مستشرقین اور انگریزی تراجم............۱۰۰روپے
پیکر دین ودانش: امام غزالیؒ............۳۰۰روپے
معلمِ عصر: سعید نورسیؒ............۲۰۰روپے

ان کے علاوہ پچھلے عام شمارے بھی ۱۰۰روپے کی شرح سے دستیاب ہیں۔ اسٹاک محدود ہے۔ پانچ شماروں پر ۲۵فیصد تجارتی کمیشن بھی دیا جائے گا۔ محصول رجسٹرڈ ڈاک خریدار کے ذمے ہوگا۔

رابطہ

ذاکرحسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

رسالہ جامعہ

کے خاص شمارے

جشن زریں نمبر	۱۰۰روپے
ڈاکٹر مختار احمد انصاری	۱۰۰روپے
سالنامہ ۱۹۶۱ء	۱۰۰روپے
اسلم جیراجپوری نمبر	۱۰۰روپے
پروفیسر محمد مجیب نمبر	۱۰۰روپے
مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں	۱۵۰روپے
پریم چند کی یاد میں	۱۰۰روپے
نہرو نمبر	۱۰۰روپے
جامعہ پلاٹینم جوبلی نمبر	۱۰۰روپے
ابوالکلام آزاد نمبر (پہلی اور دوسری جلد)	۳۰۰روپے
خواجہ حسن نظامی اور اُردو نثر	۱۰۰روپے
خلیل الرحمن اعظمی کی یاد میں	۱۰۰روپے
بلونت سنگھ کی یاد میں	۱۰۰روپے
ابوالفضل صدیقی کی یاد میں	۱۵۰روپے
نذرِ انیس	۳۰۰روپے
گاندھی اور گاندھیائی فکر	۳۰۰روپے
محمد علی اور پروانۂ آزادی	۳۰۰روپے

ان کے علاوہ پچھلے عام شمارے بھی (۱۹۶۱ء تا حال) فی ۱۰۰/ روپے کی شرح سے دستیاب ہیں۔ اسٹاک محدود ہے۔ پانچ شماروں پر ۲۵ فیصد تجارتی کمیشن بھی دیا جائے گا۔ محصول رجسٹرڈ ڈاک خریدار کے ذمے ہوگا۔

رابطــہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵